جلد ٦٩ جولائی ۱۹٦۸ء عدد ۵

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زر سالانہ : ۷ روپے
فی پرچہ : ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۹	جولائی ۱۹۶۸ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ	عدد ۵

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ-لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مئی ۱۹۶۸ء کے ترجمان القرآن میں اُن فشاری گروہوں (PRESSURE GROUPS) کا ذکر کیا گیا تھا جو اس وقت دنیائے اسلام میں دعوتِ دین اور احیائے اسلام کے راستے میں حائل ہیں۔ اِس مرتبہ ہم اُن طبقوں کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جو ابتدائی مراحل میں اس تحریک کو قوت و طاقت فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ نشاندہی ہم اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ دعوت کا کام کرنے والے اس فرض کو زیادہ بہتر طریق سے سرانجام دے سکیں۔

اس بات کا متعدد بار مشاہدہ ہوا ہے کہ ہمارے بعض رفقائے کار اجتماعی نفسیات سے عدمِ واقفیت کی بنا پر ایسے حلقوں کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بناتے ہیں جہاں برسوں کی محنت اور مشقت کے بعد بھی انہیں کوئی نمایاں کامیابی نصیب نہیں ہوتی اور پھر وہ دل گرفتہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ غلط نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ اب یہ دعوت کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔

اس سلسلے میں بحث کا آغاز کرنے سے پہلے ہم ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے اِس تجزیے سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم بعض حلقوں کو بالکل نظر انداز کرنے کے حق میں ہیں۔ اللہ کا دین بارانِ رحمت کی حیثیت رکھتا ہے جس سے ہر فرد اور گروہ کو فیض یاب ہونے کے برابر مواقع میسر آنے چاہئیں۔ البتہ ہمیں مختلف افراد اور گروہوں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں دعوت دینی چاہیے اور پھر اُن کی مخصوص نفسیاتی کیفیات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اُن سے توقعات وابستہ کرنی چاہییں۔ ہماری ان گذارشات کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ ہمیں اپنی زیادہ تر توجہ اُن لوگوں کی طرف مبذول کرنی چاہیے جن کے دل و دماغ اس دعوت کو قبول کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔

کسی تحریک کے لیے سب سے زیادہ نکمے اور بیکار وہ لوگ ہیں جو حقیقت کو اچھی طرح جان لینے کے باوجود اپنے کسی تعصب یا ذاتی اغراض کی بنا پر اُس کی مخالفت کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی خواہشات کو خدا بنا رکھا ہو اُن سے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ مفادات کی محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود کوئی گھاٹے کا سودا کرنے پر آمادہ ہونگے بہت بڑی سادگی ہے۔ دینی تحریک کے جو کارکن ان مفاد پرست طبقوں میں کام کرتے ہیں وہ یقیناً اپنے اخلاص اور اپنی جدوجہد کے لیے اللہ کے ہاں اجر کے مستحق ہیں لیکن انہیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جس زمین پر وہ محنت صرف کر رہے ہیں وہ بنجر ہے۔ کوئی شخص بیک وقت دو بندگیوں کو نباہ نہیں سکتا۔ جن لوگوں نے مفادات کی بندگی اختیار کر لی ہے وہ آخر اس بندگی کے ساتھ خدا کی بندگی کا حق کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔ سادہ لوح عوام ان لوگوں کی زبان سے بعض اوقات اسلام اور اسلامی نظام کے متعلق تعریفی جملے سن کر بڑے مسحور ہوتے ہیں اور ان سے بڑی مقدس آرزوئیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ لیکن جب ان کا پورا طرز عمل اسلام کے خلاف پاتے ہیں تو پھر مایوسی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ جو لوگ اس دنیا میں اسلامی نظام کے قیام کا عزم لے کر اٹھے ہیں انہیں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے کہ مفادات کے یہ بندے اگر اسلام کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہتے بھی ہیں تو عالم واقعات میں اس کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں۔ کسی شخص کو کسی عقیدے سے کس قدر سچی وابستگی اور لگاؤ ہے، عالم اسباب میں اسے ناپنے کا صرف ایک ہی پیمانہ ہے اور وہ یہ کہ وہ شخص اس کے لیے کس قدر ایثار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی فرد یا گروہ اسلامی نظام کی برکات کا تو حسبِ ضرورت ذکر کر دیتا ہے، لیکن وہ اس کی خاطر اپنے کسی معمولی سے معمولی مفاد کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یہ وابستگی حلق سے نیچے نہیں اتری۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک فرد یا گروہ اسلام کی محبت کا دم بھی بھرتا ہو لیکن اس کی ساری وابستگیاں اور اس کی ساری دلچسپیاں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو اسلام کی بیخ کنی پر تلے ہوئے ہیں۔ جو شخص ان کی چیرہ دستیوں میں ان کا ساتھ بھی دے، ان کے ہر صحیح اور غلط فیصلے میں اُن کی تائید بھی کرے۔ اور اس کے بدلے میں اُن سے ناجائز مراعات بھی حاصل کرتا چلا جائے، اس کے بارے میں آخر عقل کس طرح باور کر سکتی ہے کہ اسے اپنے ان دنیاوی مفادات سے زیادہ بھی کوئی چیز عزیز ہے۔ آپ جب بھی کسی نظریے یا عقیدے کو اپناتے

ہیں تو لامحالہ آپ اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ جو چیزیں یا جو مفادات اس کی ضد ہیں آپ انہیں تیاگ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ دو متضاد نظریات یا دو متضاد عقائد، خصوصاً جب ان کے عملی تقاضے ایک دوسرے سے یکسر متصادم ہوں، آخر ان کو کس طرح بیک وقت دل و جان سے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اسلام اگر کسی فرد یا گروہ کو عزیز ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مفادات اسلام کے منافی ہیں یا جو اقدار اس کی عظمت کے لیے نقصان دہ ہیں، یا جو طور طریق اس کی راہ میں مزاحم ہونے والے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انہیں ٹھکرا دیا جائے۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ کوئی فرد یا گروہ اپنی بعض کمزوریوں کی بنا پر انہیں پوری طرح ٹھکرا دینے پر قادر نہ ہو یا وہ اپنے آپ میں اس ایثار کے لیے ہمت نہ پاتا ہو، لیکن اس بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسلام کو نظریۂ حیات مان لینے کے باوجود زندگی کے دوسرے نظریوں سے بیزار نہ ہو۔ اُسے اسلام سے جتنی گہری محبت اور عقیدت ہو گی اُسی نسبت سے وہ اُن سے نفرت کا اظہار کرے گا۔ یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں کہ ایک شخص اسلام کی محبت کا دعویدار بھی ہو لیکن اپنے طرزِ فکر و طرزِ عمل میں کوئی معمولی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

نہ تم بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی
مَیں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

کلمۂ طیبہ میں اثبات سے پہلے جو نفی رکھی گئی ہے وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب تک جھوٹے خداؤں کا ابطال نہیں کیا جاتا، ان کی محبت سے دل خالی نہیں ہوتے اس وقت تک خدائے برحق کے ساتھ تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ نفی کا یہ حصہ غیر معمولی طور پر معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مَیں خدا کے اقرار سے پیشتر اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ اُس ایک معبودِ حقیقی کے علاوہ باقی سارے معبود باطل ہیں۔ آپ اگر انبیاء علیہم السّلام کی دعوت اور اُن کی مخالفت کرنے والے افراد اور گروہوں کے طرزِ عمل کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ لوگ جس بات پر مشتعل ہوتے تھے وہ خدا کے وجود کا اقرار نہ تھا بلکہ اس اقرار کے ساتھ جب اس کے عملی تقاضے سامنے آتے اور یہ اقرار ان سے اس بات کا مطالبہ کرتا کہ وہ ان سارے بُتوں کی نفی کریں جن کو انہوں نے معبود بنا رکھا تھا، خواہ وہ پتھر کے بُت ہوں یا قوم و وطن کے بُت، یا نسل و رنگ کے بت، یا مادّی

مفادات اور نفسانی خواہشات کے بت ۔ تو اس وقت اُن کی طبیعتوں میں ہیجان پیدا ہوتا تھا اور وہ ان مقدس ہستیوں کو سُتانے کے درپے ہو جاتے تھے ۔ ذات باری تعالیٰ کے وجود کا مجرد اقرار تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی جس سے دنیا میں اتنی شدید کشمکش برپا ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے لاتعداد بندوں کو ہر دور میں غیر معمولی مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ۔ گمراہ افراد اور باطل گروہ اقرارِ خدا پر اُس وقت بھڑکتے ہیں جب اس کے عملی مطالبات اور تقاضے سامنے آتے ہیں ، اور وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس اقرار کے نتیجے میں انہیں خود کن مفادات سے دستبردار ہونا پڑے گا ' انہیں اپنے نظامِ فکر و عمل میں کیا تبدیلیاں کرنی پڑیں گی ۔ اور انہیں اپنے معاشرتی ، معاشی اور اجتماعی ڈھانچوں میں کیا تغیرات لانے پڑیں گے ۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۔	کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس یہ کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے ' چھوڑ دیئے جائیں گے اور انہیں آزمائش میں نہ ڈالا جائے گا ۔
(عنکبوت ۔ ۱)	

اس ضمن میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ہر فرد اور ہر گروہ کی آزمائش ایک طرح کی نہیں ہوتی ۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ ایمان کے دعوے کرنے والوں کے ایمان کو جانچنے کے لیے اُن سے اس چیز کو قربان کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو انہیں سب سے زیادہ عزیز ہو ۔ کیونکہ وہ جب تک اُس کی قربانی پر آمادہ نہ ہوں اس وقت تک وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ بندگیٔ رب کے دعوے میں مخلص ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں سے مختلف مطالبات کیے گئے ۔ اگر ایک قوم بتوں کی پرستار تھی اور اس کا دل مٹی کی مورتیوں میں اٹکا ہوا تھا تو اُسے یہ کہا گیا کہ اللہ پر ایمان کے ثبوت میں سب سے پہلے اپنے دل کو ان کی محبت سے پاک کرو ۔ اگر کوئی قوم جبلہ جو تھی اور وہ فریب کاریوں کے ذریعے اپنے مفادات پر کوئی آنچ نہ آنے دیتی تھی تو اُس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ تم سب سے پہلے اپنی اس ذہنیت کو بدلو اور مفادات کے بُت کو اپنے ہاتھ سے پاش پاش کرو ۔ اگر کسی قوم کی گھٹی میں بے حیائی پڑی ہوئی تھی اور وہ اپنی اس نفس پرستی پر جان دیتی تھی تو اُس سے دوسرے سارے تقاضوں سے پیشتر اس امر کا تقاضا کیا گیا کہ تم اس کی پرستش کو تیاگ دو ، کیونکہ جب تک تم اس الٰہ کا ابطال

نہیں کرتے تم سچے خدا پر ایمان کے دعوے میں مخلص نہیں ہو سکتے۔ پھر جو قوم لین دین میں کھری نہ تھی اور مختلف نوعیت کی دھوکہ بازیوں سے ناجائز مال حاصل کرنے کی عادی تھی اُسے سب سے پہلے اس سے باز رہنے کی تلقین کی گئی۔ جس قوم نے دولت کو اپنا مقصود و مطلوب بنا رکھا تھا اُس کے لیے آزمائش یہ رکھی گئی کہ وہ سب سے پہلے اپنے دل سے اُس تیرگی کو دُور کرے جو دولت پرستی کی وجہ سے دل کی دُنیا کو تاریک کر دیتی ہے۔ کیونکہ جب تک یہ تیرگی دُور نہ ہو ایک قلبِ ایمان کے نُور سے کس طرح منور ہو سکتا ہے؟

جس طرح مختلف صنم خانوں میں مورتیوں اور بُتوں کی شکلیں اُن کے تراشنے اور بنانے والوں کے ذوق کے اختلاف کی وجہ سے جُدا جُدا ہوتی ہیں بالکل اسی طرح انسانوں نے بھی اپنے دل کے صنم خانوں میں جو بُت سجا رکھے ہیں اُن کی نوعیت بھی ایک سی نہیں ہوتی۔ ہر فرد کا صنم خانہ اُس کے اپنے تعصبات کے بتوں اور اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی مورتیوں سے آباد ہوتا ہے۔ جب جبینِ نیاز خدا کی بارگاہ میں جھکنے سے احتراز کرے تو پھر کوئی ایک چوکھٹ نہیں رہتی جس پر جھک کر کوئی فرد اپنے احساسِ عبودیت کی تسکین کر سکے۔ پھر تو وہ ہزاروں چوکھٹوں پر جھکنے کے لیے بیتاب رہتی ہے۔ وہ کبھی حکمرانوں کی چوکھٹ پر جھکتی ہے کبھی قوم اور وطن اور کبھی رنگ و نسل کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے اور کبھی مادی مفادات اور اغراض کی مورتیوں کے حضور میں اظہارِ بندگی کرتی ہے۔ جب انسان ایک خدا کی غلامی کو ترک کر دے تو پھر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں خدا اُس سے اپنی بندگی کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں اور وہ اُن کی غلامی اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے

اللہ پر ایمان ایک ایسا دعویٰ ہے جو فکر و عمل میں ایک بنیادی تبدیلی کا متقاضی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ
اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ
اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ

اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور

مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (۲۴)
اُس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔

اس آیت میں نہایت کھلے الفاظ میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ ایمان کے کچھ بنیادی تقاضے ہیں اور ان میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ بنیادی تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے فکر و عمل کے سارے زاویے اور سعی و جہد کے سارے میدان بدل جائیں۔ اللہ پر ایمان جب تک اُس کے دل و دماغ میں ترجیحات کے نئے معیار اور نئے نئے پیمانے (SCALES OF PREFERENCES) نصب نہیں کرتا اُس کا ایمان اللہ کے نزدیک کبھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ ان نئے پیمانوں کے مطابق اللہ اور اُس کے رسول کی رضا دنیا کی ہر دوسری چیز کے مقابلے میں اُس کے نزدیک وزنی ہونی چاہیے اور اُس کے حصول کے لیے تگ و دو اُس کا سب سے بڑا سرمایۂ حیات ہونا چاہیے۔ اس معیار ہی سے اُس کے اخلاص کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کے اس بنیادی اصول کو سامنے رکھتے ہوتے ہم مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ کون کون سے عناصر دعوتِ دین کے لیے زیادہ مفید اور مُؤثر ہو سکتے ہیں۔

کسی تحریک کے لیے سب سے زیادہ مفید اور کارآمد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اُس کے لیے سب سے زیادہ ایثار کر سکتے ہیں، جو اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کے صنم کدوں کو مسمار کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، اور اُن کا یہ طرزِ عمل کسی وقتی و عارضی ہیجان کا نتیجہ نہ ہو بلکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ہر معاملے کو پوری طرح تول کر، اُس کے مختلف پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے یہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر آمادہ ہوں ہمیں سب سے زیادہ توجہ ایسے ہی سلیم الفطرت لوگوں پر صرف کرنی چاہیے۔ وقتی جوش اور ہیجان سے بسا اوقات بڑے نمایاں کام سرانجام پا جاتے ہیں، لیکن اس سے وہ تحریکیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں جو انسان کو بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر خدائے واحد کی غلامی کا درس دینے کے لیے اٹھی ہوں۔ دنیا کے سارے کاموں میں سے یہ کام سب سے زیادہ مشکل، سب سے زیادہ صبر آزما اور سب سے زیادہ ایثار کا طالب ہے۔ اس بنا پر وقتی ہنگاموں کے خوگر انسان اس کے لیے قطعاً مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتے۔ انسان کے لیے اپنی کسی ایک عادت ہی کو بدلنا بڑا مشکل ہوتا ہے، کہاں یہ بات کہ وہ اپنی زندگی کے

سارے معیارات، خوب و ناخوب کے سارے پیمانے بدل ڈالے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ پورے شعور کے ساتھ اپنے مفادات کے صنم کدے اور اپنی غلط خواہشات کے بت خانے توڑ کر اس دعوت کو قبول کریں وہی پہاڑی کے چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس معاملے میں ہمیں جس چیز پر سب سے زیادہ غور کرنا چاہیے وہ یہ نہیں کہ دعوت کے قبول کرنے والے کے اندر ایک حرکت و حرارت پیدا ہو گئی ہے، یا وہ بڑھ چڑھ کر ہمارے بعض کاموں میں ہمارے ساتھ تعاون کرتا ہے، یا کبھی ہمارا مخالف تھا اور آج ہمارا ہمدرد ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ان مفادات کے بارے میں اس کا طرزِ فکر اور طرزِ عمل کہاں تک بدلا ہے جو اسے پہلے عزیز تھے۔ کیا وہ اس دعوت کو قبول کر کے ان مفادات کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے جن کی وہ پہلے پرستش کرتا تھا؟ دعوت کے ساتھ مجرد ہمدردی یا تحریک اور داعیٔ تحریک کے بارے میں کوئی کلمۂ خیر زبان سے نکال دینا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔ اصل چیز یہ ہے کہ کسی شخص نے اس دعوت کو کتنے خلوص کے ساتھ اپنایا ہے۔ دلوں کا راز تو خدا ہی جانتا ہے لیکن اس کو پرکھنے کا ظاہری معیار ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو چیزیں اس دعوت کی ضد ہیں ان کے بارے میں اس نے کیا روش اختیار کر رکھی ہے۔ اس بنا پر کسی تحریک کے لیے سب سے زیادہ مفید اور کارآمد وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کے لیے اپنے مفادات کی زیادہ سے زیادہ قربانی دینے پر آمادہ ہوں۔

پھر مفادات کے ایثار کا نہ تو کوئی لگا بندھا ضابطہ ہے اور نہ اس کی کوئی متعین صورت ہے۔ اس کے بارے میں ہر شخص خود اپنا محاسب اور منصف ہوتا ہے۔ دلوں کے اندر جو چور چھپے ہوئے ہوں، جذبات و احساسات کی گہرائیوں میں جو مفاسد خاموشی کے ساتھ ضمیر و ایمان کے اندر نقب لگانے میں مصروف ہوں انہیں نہ تو باہر کا کوئی محتسب گرفتار کر سکتا ہے اور نہ کوئی جج انہیں سزا دے سکتا ہے۔ اندر کے ان خائنوں اور نقب زنوں کو انسان خود بھی بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ ہی پہچاننے میں کامیاب ہوتا ہے اور پھر وہ خود ہی اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ اس کے ایمان کو کس طرح غارت کر رہے ہیں۔

بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک انسان کسی تحریک میں بڑے جوش و ولولے کے ساتھ شامل ہوتا

ہے اور اس کے لیے جدوجہد بھی کرتا ہے لیکن اپنے بنیادی مفاد کو معمولی نقصان پہنچانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یوں تو ان مفادات کی کئی نوعیتیں ہیں لیکن ان میں پانچ خاص طور پر بڑی اہم ہیں۔ یہاں ہم ان کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

مفاد کی پہلی قسم جو کسی فرد یا گروہ کے لیے زنجیرِ پا ثابت ہوتی ہے دنیوی مفاد ہے، اور یہ مفاد بھی کچھ ایک طرح کا نہیں ہوتا۔ اس کی ایک بڑی قسم مالی مفاد ہے جس نے بے شمار لوگوں کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ لوگ جس فرد یا گروہ یا طبقے کے ساتھ اپنا یہ مفاد وابستہ پاتے ہیں اس کی مرضی کے خلاف جنبش تک کرنے کی ہمت وہ اپنے اندر نہیں پاتے۔ دورِ جدید میں جب کہ دولت پرستی نے ایک جنون کی شکل اختیار کر لی ہے اور ہر شخص یا گروہ مال و متاع پر فریفتہ ہو رہا ہے۔ یہ مفاد غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ دعوتِ اسلامی کو قبول کرنے کے معنی آج یہ ہیں کہ آدمی حکومت سے بگاڑ پیدا کرے۔ اُس کی خصوصی مراعات سے محروم ہونے کے لیے تیار ہو اور اس کے حامی طبقوں کی نظرِ عنایت سے بھی محروم ہو جائے۔ اس پر مزید یہ کہ دولت کمانے اور دولت صرف کرنے میں اخلاقی حدود کا بھی اپنے آپ کو پابند بنائے اور اس طرح آرام و آسائش اور فراوانی کی زندگی چھوڑ کر رضا کارانہ طور پر افلاس کو سینے سے لگائے۔

مالی مفاد کے علاوہ بسا اوقات اقتدار کا نشہ بھی حق بات کو قبول کرنے کی راہ میں مزاحم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی فطرت میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں میں نمایاں ہوں اور انہیں ان پر حکومت کرنے کے حقوق حاصل ہوں۔ اس مزاج کے لوگوں کے لیے کسی ایسی تحریک میں شمولیت تو درکنار اس کی تائید بھی ممکن نہیں ہوتی جو اُن کی اس خواہش اور آرزو کو پورا نہ کر سکے۔ اس لیے یہ لوگ بالعموم حکومتِ وقت کا ساتھ دیتے ہیں اور اُس کی بے پناہ قوت سے فائدہ اٹھا کر اپنی حیثیت کو ابھارتے اور اپنے اپنے حلقوں میں غیر معمولی اثر و رسوخ پیدا کر کے اپنے اس جذبے کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کو اپنی قوم، اپنی برادری اور اپنی نسل سے بے پناہ محبت ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ کسی ایسے مسلک کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے جن سے اُن کی اس محبت کو نقصان پہنچنے کا کوئی

احتمال ہو۔ان بتوں کو توڑنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور یہ کام وہی لوگ سرانجام دے سکتے ہیں جنہیں ایک طرف تو کسی تحریک سے سچی اور گہری وابستگی ہو اور دوسرے اُن کے اندر بے انتہا عزم اور حوصلہ ہو۔

پھر ان مفاد پرستوں میں ایک طبقہ وہ بھی ہوتا ہے جو اگرچہ حکومت کا ممنون تو نہیں ہوتا اور اُسے مالی مفادات بھی کوئی اتنے عزیز نہیں ہوتے لیکن جس حلقے سے وہ وابستہ ہوتے ہیں وہاں اُن کی قیادت وسیادت کا سکہ چلتا ہے وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے اس حلقے سے نکل کر کسی تحریک میں شامل ہو گئے تو وہاں اُن کی انا کی تسکین کے لیے انہیں کوئی زیادہ سامان میسر نہ ہوگا۔اس لیے وہ ہمیشہ اس میں شمولیت سے گریز کرتے ہیں۔اس طبقے کو ہر قدم پر مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اس کے پیروا سے کبھی بھی خاموش تماشائی کی حیثیت سے زندہ نہیں رہنے دیتے۔وہ کبھی اشاروں اور کنایوں سے اور کبھی کھل کر اُن سے نئی اُبھرنے والی تحریک کے بارے میں سوالات کرتے رہتے ہیں۔اب اگر یہ تعریف کے چند جملے کہہ دیں تو پھر اگلا سوال یہ ہوتا ہے کہ خود حضور کیوں اس میں شرکت نہیں فرماتے۔اس عدم شرکت کی وجہ تو کچھ اور ہوتی ہے لیکن وہ اسے زبان پر لا نہیں سکتے اس لیے اس تحریک میں کئی قسم کے کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں اور داعیٔ تحریک کے بارے میں عجیب وغریب اور بے بنیاد باتیں گھڑ گھڑ کر اپنے ماننے والوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ ایک فتنہ ہے جو اس شخص نے کھڑا کر دیا ہے اور وہ محض للہ و فی اللہ اس کا قلع قمع کرنے میں مصروف ہیں۔سادہ دل اور ناواقف پیرو تو ناسمجھی کی وجہ سے اس "جہاد" میں پورے خلوص کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔لیکن رہنما جان بوجھ کر اپنی قیادت وسیادت کے تحفظ کے لیے اس کام کا بیڑا اٹھاتا ہے۔

دولت پرستی، اقتدار پرستی اور انا پرستی میں الفاظ کا اختلاف تو ہے لیکن حقیقت کا کوئی اختلاف نہیں۔اگر ایک فرد یا گروہ دولت کے لالچ میں کسی تحریک سے الگ رہتا اور اس کی مخالفت کرتا ہے تو دوسرا اپنی انا کا پجاری ہونے کی وجہ سے یہی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔بلکہ نتائج کے اعتبار سے تو دوسرے کی روش پہلے کی روش سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔جو لوگ حکومت وقت کے ساتھ اپنے مخصوص مفادات کی وجہ سے وابستہ ہوتے ہیں انہیں عوام بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ کس کردار کے لوگ ہیں۔لیکن انا کے پجاریوں کا بسا اوقات دینی اور مذہبی حلقوں پر تسلط قائم

ہوتا ہے اور اُن کے بارے میں عوام نہایت اچھے جذبات رکھتے ہیں۔ اس لیے جب یہ طبقہ یورش شروع کرتا ہے تو سادہ لوح مخلوق اُن کی اس جدوجہد کو دینی فریضہ سمجھ کر ان کا ساتھ دیتی ہے۔

ایثار خواہ وہ مالی ہو یا جسمانی، بڑا قابلِ قدر ہے لیکن سب سے زیادہ قابلِ قدر انانیت کی قربانی ہے۔ جو شخص اپنی انا کو کسی مسلک پر نچھاور کر دیتا ہے وہ بلاشبہ ایک عظیم انسان ہے اور اُس کے اندر بے پناہ خلوص پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اپنی شخصیت کے بُت کو جو انسان کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے توڑ کر آیا ہے اور اُس نے صحیح معنوں میں ایک دعوت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کیا ہے۔ آپ اگر اس ملک کے مختلف دینی حلقوں کے سربراہوں کی جماعت اسلامی سے مخاصمت کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو محض انا پرستی کے جنون میں مبتلا ہو کر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ یہ جن باتوں کی آڑ لے کر جماعت اور امیرِ جماعت کے خلاف ہنگامے کھڑے کر رہے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جو ہمارے سلف کے لٹریچر میں نہ ملتی ہو۔ خود ان کے اپنے حلقے کے بزرگوں کی تحریروں اور تقریروں کے جو ریکارڈ آج موجود ہیں اُن میں سے بے شمار ایسی باتوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو انہی موضوعات پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی باتوں سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ اگر اُن کی توجیہ اور تاویل میں خیر کا پہلو نکالا جاسکتا ہے تو آخر یہ سلوک اس تحریک کے داعی کے ساتھ کیوں روا نہیں رکھا جاتا۔ کیا یہ حضرات فقہ، علمِ کلام، اور تاریخ کی برسہا برس کی تعلیم و تدریس کے بعد ابھی تک اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ فقہی مسائل میں اختلاف یا تاریخی شواہد سے استنباط کا فرق، بشرطیکہ نیت بخیر ہو، کوئی ایسی چیز نہیں جس پر اتنی شورش برپا کی جائے۔ کم علم اور جاہل لوگ اگر اس قسم کی الزام تراشیاں کریں تو یہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہیں، لیکن علم و فضل کے مدعیوں کو جماعت کے خلاف زبانِ طعن دراز کرنے سے پہلے اپنے دلوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ کہیں انا پرستی کے جنون کے زیر اثر تو یہ سب کچھ نہیں کیا جا رہا۔

دنیا کے سارے محاسبوں میں سب سے زیادہ مشکل محاسبہ اپنی ذات کا ہے۔ عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے۔ پھر انانیت تو ایک ایسی کمزوری ہے جو اپنے حق میں دلائل کے انبار لگا دیتی ہے اور نفس کو کسی وقت بھی پریشان نہیں ہونے دیتی۔ اس بنا پر جو لوگ اپنے آپ کو دین کے معاملے میں زیادہ مخلص سمجھتے ہیں انہیں اس مرض کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ امام غزالیؒ نے کس قدر صحیح بات فرمائی ہے کہ انسان کو خلوص کی اُس وقت سب سے زیادہ حاجت ہوتی ہے جب اُسے اپنے خلوص پر سب سے زیادہ اعتماد ہو۔ دین کے معاملے میں للہیت کا معیار یہ ہے کہ آدمی خدا کی خاطر کسی سے محبت رکھے اور خدا ہی کی خاطر کسی سے بغض رکھے۔ اور اس کے جانچنے کا معیار صرف ایک ہے کہ اگر کوئی شخص محبت اور نفرت کے معاملے میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور اخلاقی حدود کا لحاظ رکھتا ہے تو اس کا طرزِ عمل صحیح ہے۔ احساسِ تناسب جہاں کسی شخص کے فکری اور جذباتی توازن کو ظاہر کرتا ہے وہاں اُس کے خلوص کا اظہار بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص کسی چیز کے غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ اپنی انا کے مطابق نہیں کرتا بلکہ اللہ اور اُس کے رسُول کی تعلیمات کے مطابق کرتا ہے اور ذاتی تعصبات اور رجحانات کو راہ میں حائل نہیں ہونے دیتا۔ اس قسم کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل رکھنے والے متوازن افراد جنہوں نے اپنی انا کے بُت کو بھی پاش پاش کر دیا ہو ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہیں اور ان کی جتنی زیادہ تعداد کسی تحریک میں شامل ہو گی اُسی نسبت سے وہ تحریک کامیاب ہو گی۔

اِن افراد کے اوصاف کی نشاندہی کرنا تو اتنا مشکل نہیں لیکن عمل کی دنیا میں انہیں تلاش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اسی لیے دنیا کی ہر تحریک ایک دوسری نوعیت کے طبقے کے بل بوتے پر پروان چڑھی ہے۔ یہ طبقہ اُن افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو اگرچہ جوہر قابل ہوتے ہیں لیکن معاشرے کی مروجہ اقدار انہیں ناقابلِ التفات بنا دیتی ہیں۔ ان لوگوں میں دو نمایاں صفات پائی جاتی ہیں۔ ایک سیرت کی پختگی اور دوسرے کسی طبقے کے مخصوص مفادات سے لاتعلقی۔ قرآن حکیم نے جس طبقے کو اَلْمَلَاُ کہا ہے یہ طبقہ اُس کی عین ضد ہوتا ہے۔ پہلا طبقہ اگر خوشامد کرنے میں مشہور ہوتا ہے تو یہ طبقہ بڑا خود دار اور عزت نفس کا محافظ ہوتا ہے اور بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے اندر اپنے آپ کو خواہ مخواہ نمایاں کرنے کی خواہش نہیں ہوتی پھر

یہ گرد و پیش میں پھیلے ہوئے حالات پر غور بھی کرتا ہے اور معاشرے کی بُرائیاں دیکھ کر اپنے اندر کرب و اضطراب محسوس کرتا ہے۔

کسی ایسی انقلابی تحریک کے لیے جو اخلاقی اقدار کی سربلندی کا داعیہ لے کر اُٹھے، اس طبقے میں سے زیادہ سے زیادہ آدمی چھانٹنے کی کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ انہی میں سے بالآخر مطلوبہ اوصاف کے آدمی ملتے ہیں۔ اجتماعی نفسیات کے ماہرین نے مختلف طبقات کا جو تجزیہ کیا ہے وہ اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا کا ہر انقلاب اسی طبقے کے بل بوتے پر آتا ہے اور تاریخ انسانی اُن کے اس تجزیہ کی پوری طرح تائید کرتی ہے۔

مختلف اوقات میں جب مختلف انبیاء دین کی دعوت لے کر اٹھے تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تعداد میں اُن لوگوں نے اُن کی دعوت پر لبیک کہا جو غریب اور مفلس تھے اور جن کا رائج الوقت نظام کے مفادات کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے معاشرے میں اثر و رسوخ رکھنے والے افراد کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی بڑی خواہش اور کوشش کی لیکن انہیں اپنے فدائی اور جاں نثار زیادہ تعداد میں اسی طبقے سے ملے اور خدا نے خود بھی اپنے انبیاء کو اسی طبقے کی طرف توجہ دلائی، اس سے وابستہ رہنے کی ہدایت کی اور اس کے مخلصین کو سینے سے لگانے کی تاکید فرمائی۔ مثلاً سورۂ کہف میں ارشاد ہوا ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (۲۸)

اپنے آپ کو اُن لوگوں کے ساتھ وابستہ رکھو جو اپنے پروردگار کو محض اس کی رضا جوئی کے لیے صبح شام پکارتے ہیں اور دنیوی زندگی کی رونق کی خاطر اُن سے آنکھیں نہ پھیرو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداءً جوشِ تبلیغ میں قدرتًہ اس بات کی فکر زیادہ رہا کرتی تھی کہ رؤسائے قریش میں سے کوئی ایمان لے آئے تو دعوت کے فروغ اور امت کی قوت و طاقت میں نمایاں اضافہ ہو جائے۔ آیت میں اشارہ اس جانب ہے کہ امت کا جمال و کمال اس ظاہری ساز و سامان سے نہیں بلکہ اُس اخلاص سے ہے جو لوگوں کے سینوں میں موجود ہے۔ دین کے لیے یہی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے اور اس کی سب سے زیادہ قدر ہونی چاہیے۔ باقی رہے وہ لوگ جن کی آنکھوں کو مادی مال و اسباب کی فراوانی نے خیرہ کر رکھا ہو

جن کے دل دولت اور ثروت کی محبت سے لبریز ہوں، جن کے سر میں اقتدار کا سودا سمایا ہُوا ہو وہ بھلا ایک ایسی دعوت کو کس طرح قبول کر سکتے ہیں جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں بے وزن اور حقیر سمجھتی ہے اور اپنے ماننے والوں سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اللہ کی رضا اُن کے فکر و عمل کا واحد محرک ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہ فرمایا کہ خوش نصیب ہیں غربا اور آسمانی بادشاہت اُن کے لیے ہے تو اُن کی مراد اسی قسم کے لوگوں سے تھی جن کی نظروں کو دنیا کی زیب و زینت نے فریفتہ نہ کر رکھا ہو۔ حضرت اُسامہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مَیں جنت کے دروازے پر کھڑا ہُوا اُس میں اکثر داخل ہونے والے لوگ مسکین تھے اور دولت مند روک دیے گئے۔ قرآن و حدیث، آثار صحابہ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں اس نوعیت کے لاتعداد اقوال اور غریبوں اور مسکینوں سے محبت کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں لیکن یہاں ان اقوال اور اُن واقعات کو درج کرنا مقصود نہیں۔ مجھے دراصل اُس مقدس رجحان کی نشاندہی کرنی ہے جو دعوتِ دین کے علمبرداروں میں رفقا کے انتخاب کے معاملے میں ملتا ہے۔

ہم آج جس دَور سے گزر رہے ہیں، یہ مال و اسباب کی فراوانی کی وجہ سے بڑے عروج کا دور ہے۔ آج دولت کی فی الحقیقت پرستش ہوتی ہے۔ کسی فرد کا مرتبہ و مقام اسی کے لحاظ سے مشخص کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ معاشرے میں سرکاری اثر و رسوخ نے بھی غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ پھر خاندانی وجاہت اور رعونت بھی ہماری اجتماعی زندگی پر نہایت مؤثر طریق سے اثر انداز ہو رہی ہے۔ ان سب چیزوں کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قرآن و سنت کی تعلیم، انسانی تاریخ اور قانونِ قدرت کے مطالعے اور مشاہدے سے اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ یہ طبقے مؤثر ہونے کے باوجود ایک حقیقی انقلاب کے لیے اور خصوصاً دینی انقلاب کے لیے بالکل بیکار ہوتے ہیں بلکہ دعوتِ دین کی راہ کا سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ جس طبقے کو قرآن نے الملاء کہا ہے وہ کسی مخصوص گروہ کا نام نہیں ہے بلکہ دنیا پرستوں کے اس مجموعہ کا نام ہے جو مختلف قسم کے مفادات کی بندگی میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس وقت تک دل و جان

سے کسی تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتے جب تک انہیں مروجہ نظام کے بقا کی کچھ بھی امید باقی ہو۔ یہ اس وقت اٹھ کر آتے ہیں جب انہیں اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ اب مفادات کے حصول کا راز کسی دوسرے نظام سے وابستہ ہونے ہی میں مضمر ہے۔ ان میں سلیم الفطرت انسانوں کی ایک نہایت ہی تھوڑی تعداد کسی دعوت کی صداقت کو دیکھ کر آغاز میں اسے قبول کر لیتی ہے، ورنہ اس طبقے کی اکثریت اُس وقت تک اس کی مخالفت کرتی ہے جب تک اُسے یہ بات اچھی طرح محسوس نہ ہو جائے کہ اب مروجہ نظام کا بقا کسی صورت بھی ممکن نہیں رہا اور نئی دعوت اب غالب آ کر ہی رہے گی۔

اسی اصول کے تحت دُنیا کی ہر تحریک اپنی قوت کے لیے اُن افراد اور طبقوں کی طرف رجوع کرتی ہے جو کسی رائج الوقت نظام کی تہ مانیوں سے پسے ہوئے ہوں اور انہی کو اپنے ساتھ ملا کر وہ آگے بڑھتی ہے۔ انقلاب کے ایک بہت بڑے مزاج شناس نے ایک بڑی حکمت کی بات کہی کہ انقلاب پاؤں پر چل کر آتا ہے اور جھونپڑوں میں پرورش پاتا ہے اور پھر ایوانوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔ محلات میں رہنے والے نہ تو کسی نظام کے بگاڑ کو پوری طرح محسوس کر سکتے ہیں نہ ان میں یہ ہمت اور طاقت ہوتی ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی عملی اقدام کر سکیں۔ کیونکہ ان کے مفادات اسی سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان میں ایثار کی یہ قوت بھی نہیں ہوتی کہ اس کے بگاڑ کو وہ محسوس کر بھی لیں تو اپنے آرام و آسائش، اپنے مرتبہ و مقام اور اپنے اونچے عہدوں کو چھوڑ کر کسی انقلابی تحریک کا ساتھ دے سکیں۔ ان طبقوں کی ظاہری حالت اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہے اور انسان یہ سوچتا ہے کہ اگر یہ طبقے ساتھ دینے لگیں تو منزلِ مقصود بہ آسانی حاصل ہو جاتے لیکن تاریخ کا یہ بھی ناقابلِ تردید فیصلہ ہے کہ انہوں نے کبھی چند استثنائی مثالوں کے سوا کسی ایسی تحریک کا ساتھ نہیں دیا جو اخلاق کی دنیا بدلنے اور دنیا پرستی کی جگہ خدا پرستی قائم کرنے کی علمبردار ہو۔

اس مرتبہ ہمیں یہ گزارشات اس لیے پیش کرنی پڑیں کہ ہمارے رفقا اجتماعی نفسیات کے تجربوں سے واقف ہوں اور وہ خواہ مخواہ اپنی توقعات اُن گروہوں سے وابستہ نہ کر لیں جو کبھی ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ اس حقیقت کو نگاہ میں نہ رکھنے کی وجہ سے بسا اوقات ان کے دلوں پر عجیب و غریب کیفیات طاری ہونے لگتی ہیں۔ میں یہاں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ بعض رفقاء سے جب جماعت اسلامی کی رفتارِ کار کا ذکر کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اس بات سے بڑی فکر لاحق ہے کہ جماعت میں نامور علماء، معروف پروفیسر، مشہور صحافی، نمایاں اہلِ علم اور بڑے سیاسی لیڈر کیوں نہیں آرہے ہیں اور آنے والوں میں زیادہ تعداد متوسط طبقے کے غیر معروف افراد کی ہے۔ جماعت کے ہمدرد اس موضوع پر اخلاص کی بنا پر غور کرتے ہیں لیکن مخالفین اسے جماعت اسلامی کی ناکامی کی بہت بڑی دلیل سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ سارا کھیل ایک شخص کی ذہانت اور قوتِ استدلال کی وجہ سے کھیلا جا رہا ہے ورنہ درحقیقت اس تحریک کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے۔ نامور مذہبی شخصیتیں اس سے الگ ہیں، مشہور اہلِ علم اس کے مخالف ہیں اور اس میں شامل ہونے والے نیم خواندہ اور نچلے طبقے کے لوگ ہیں۔ خدا گواہ ہے کہ میں جب ان لوگوں کے یہ طعنے اور اندیشے سنتا ہوں تو مجھے اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ ہم صحیح راہ پر گامزن ہیں۔ اگر ہم مفادات کے بُت توڑنے کے لیے نہ اُٹھتے تو مفاد پرست، اقتدار پرست اور انانیت پرست ہمارا ساتھ دیتے۔ لیکن آخر ان حالات میں جبکہ ہم ہر قسم کے غلط مفادات کے خلاف صف آرا ہیں تو یہ طبقے ہمارا کس طرح ساتھ دے سکتے ہیں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت مروجہ اقتدار سے، خواہ وہ سیاسی ہوں، یا مذہبی یا معاشرتی، وابستہ ہے وہ کیونکر کسی ایسی تحریک کے ساتھ دل و جان سے وابستہ ہو سکتے ہیں جو اجتماعی زندگی کے پورے ڈھانچے کو بدلنے کا عزم رکھتی ہے۔ آدمی تو اپنے کسی جھونپڑے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا، مفادات کے اُن رفیع الشان محلات اور ایوانوں کو آخر کس طرح چھوڑ سکتا ہے جو انہوں نے بڑی آرزوؤں اور تمناؤں اور غیر معمولی مشقت کے ساتھ تعمیر کیے ہیں۔ اس لیے بالکل فطری طور پر ہماری دعوت پر وہی لوگ لبیک کہیں گے جنہیں یا تو دعوتِ حق دنیا کی ہر چیز سے، اقتدار سے، مال و دولت سے، معاشرتی اثر و رسوخ سے زیادہ عزیز ہے یا وہ لوگ ہمارے شریکِ کار ہوں گے جن کی نہ تو کوئی انا ہے اور نہ کوئی مخصوص مفاد۔ مذہب کی زبان میں انہیں لوگوں کو مسکین کہا جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہمارے ساتھ جو رفقاء شامل ہو رہے ہیں اور یہ جس طبقے سے کھنچے چلے آ رہے ہیں انہیں دیکھ کر تو دل کو پورا اطمینان نصیب ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے دینی دعوت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ (باقی ص ۶۳ پر)

تفہیم القرآن

الممتحنہ

(۲)

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے[۱۲]۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ اُن سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں[۱۳]۔

---

۱۲ اس مقام پر ایک شخص کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ دشمنی نہ کرنے والے کافروں کے ساتھ نیک برتاؤ تو خیر ٹھیک ہے، مگر کیا انصاف بھی صرف اُنہی کے لیے مخصوص ہے؟ اور کیا دشمن کافروں کے ساتھ بے انصافی کرنی چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سیاق و سباق میں دراصل انصاف ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تمہارے ساتھ عداوت نہیں برتتا، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ عداوت نہ برتو۔ دشمن اور غیر دشمن کو ایک درجہ میں رکھنا اور دونوں سے ایک ہی سا سلوک کرنا انصاف نہیں ہے۔ تمہیں اُن لوگوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا حق ہے جنہوں نے ایمان لانے کی پاداش میں تم پر ظلم توڑے، اور تم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کیا، اور نکلنے کے بعد بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑا۔ مگر جن لوگوں نے اس ظلم میں کوئی حصہ نہیں لیا، انصاف یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور رشتے اور برادری کے لحاظ سے اُن کے جو حقوق تم پر عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرنے میں کمی نہ کرو۔

۱۳ سابقہ آیات میں کفار سے جس ترکِ تعلق کی ہدایت کی گئی تھی اس کے متعلق لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو، اور ان کے ایمان کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو[۱۴]۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار

ہو سکتی تھی کہ یہ اُن کے کافر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اِن آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ اس کی اصل وجہ اُن کا کفر نہیں بلکہ اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ ان کی عداوت اور ان کی ظالمانہ روش ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو دشمن کافر اور غیر دشمن کافر میں فرق کرنا چاہیے، اور اُن کافروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا چاہیے جنہوں نے کبھی ان کے ساتھ کوئی برائی نہ کی ہو۔ اس کی بہترین تشریح وہ واقعہ ہے جو حضرت اسماء بنت ابی بکر اور ان کی کافر ماں کے درمیان پیش آیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی قُتَیلَہ بنت عبدالعُزّٰی کافرہ تھیں اور ہجرت کے بعد مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ حضرت اسماء انہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ صلح حُدَیبیہ کے بعد جب مدینہ اور مکہ کے درمیان آمد و رفت کا راستہ کھل گیا تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے مدینہ آئیں اور کچھ تحفہ تحائف بھی لائیں۔ حضرت اسماءؓ کی اپنی روایت یہ ہے کہ مَیں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اپنی ماں سے مل لوں؟ اور کیا میں ان سے صلۂ رحمی بھی کر سکتی ہوں؟ حضورؐ نے جواب دیا اس سے صلۂ رحمی کرو (مُسنَد احمد۔ بخاری مسلم)۔ حضرت اسماء کے صاحبزادے عبداللہ بن زُبیر اس واقعہ کی مزید تفصیل یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے حضرت اسماء نے ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں جب اللہ اور اس کے رسول کی اجازت مل گئی تب وہ ان سے ملیں (مسند احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم)۔ اِس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے کافر ماں باپ کی خدمت کرنا اور اپنے کافر بھائی بہنوں اور رشتہ داروں کی مدد کرنا جائز ہے جبکہ وہ دشمنِ اسلام نہ ہوں۔ اور اسی طرح ذمّی مساکین پر صدقات بھی صرف کیے جا سکتے ہیں (احکام القرآن للجصاص۔ روح المعانی)۔

۱۴ے اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اوّل اوّل تو مسلمان مرد مکّہ سے بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے رہے اور انہیں معاہدے کی شرائط کے مطابق واپس کیا جاتا رہا۔ پھر مسلمان عورتوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور سب سے پہلے اُمّ کلثوم بنت عُقبہ بن ابی مُعَیط ہجرت کر کے مدینے پہنچیں۔ کفّار نے معاہدے کا حوالہ دے کر ان کی واپسی کا بھی مطالبہ کیا اور اُم کلثوم کے دو بھائی ولید بن عُقبہ اور عُمارہ بن عُقبہ انہیں واپس لے جانے کے

لیے مدینے پہنچ گئے۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا حدیبیہ کے معاہدے کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اسی سوال کا یہاں جواب دیا ہے کہ اگر وہ مسلمان ہوں اور یہ اطمینان کر لیا جائے کہ واقعی وہ ایمان ہی کی خاطر ہجرت کر کے آئی ہیں، کوئی اور چیز انہیں نہیں لائی ہے، تو انہیں واپس نہ کیا جائے۔

اس مقام پر احادیث کی روایت بالمعنیٰ سے ایک بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے جسے حل کرنا ضروری ہے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے متعلق احادیث میں جو روایتیں ہمیں ملتی ہیں وہ اکثر و بیشتر بالمعنیٰ روایات ہیں۔ زیر بحث شرط کے متعلق ان میں سے کسی روایت کے الفاظ یہ ہیں: من جاء منکم لم نردہ علیکم ومن جاءکم منا رددتموہ علینا "تم میں سے جو شخص ہمارے پاس آئے گا اسے ہم واپس نہ کریں گے اور ہم میں سے جو تمہارے پاس جائے گا اسے تم واپس کرو گے"۔ کسی میں یہ الفاظ ہیں، من اتی رسول اللہ من اصحابہ بغیر اذن ولیہ ردہ علیہ "رسول اللہ کے پاس ان کے اصحاب میں سے جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آئے گا اسے وہ واپس کر دیں گے"۔ اور کسی میں ہے من اتی محمداً من قریش بغیر اذن ولیہ ردہ علیہم "قریش میں سے جو شخص محمدؐ کے پاس اپنے ولی کی اجازت کے بغیر جائے گا اسے وہ قریش کو واپس دینگے"۔ ان روایات کا طرز بیان خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ ان میں معاہدے کی اس شرط کو ان الفاظ میں نقل نہیں کیا گیا ہے جو اصل معاہدے میں لکھے گئے تھے، بلکہ راویوں نے ان کا مفہوم خود اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ لیکن چونکہ بکثرت روایات اسی نوعیت کی ہیں اس لیے عام طور پر مفسرین و محدثین نے اس سے یہی سمجھا کہ معاہدہ عام تھا جس میں عورت مرد سب داخل تھے اور عورتوں کو بھی اس کی رو سے واپس ہونا چاہیے تھا۔ اس کے بعد جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آیا کہ مومن عورتیں واپس نہ کی جائیں تو ان حضرات نے اس کی یہ تاویل کی کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومن عورتوں کی حد تک معاہدہ توڑ دینے کا فیصلہ فرما دیا۔ مگر یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جس کو اس آسانی کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ اگر معاہدہ فی الواقع بلا تخصیص مرد و زن سب کے لیے عام تھا تو آخر یہ کیسے جائز ہو سکتا تھا کہ ایک فریق اس میں یک طرفہ ترمیم کر دے یا اس کے کسی جز کو بطور خود بدل ڈالے؟ اور بالفرض ایسا کیا بھی گیا تھا تو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ قریش کے لوگوں نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ قریش والے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ایک ایک بات پر گرفت کرنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ انہیں اگر یہ بات

ہاتھ آجاتی کہ آپ شرائطِ معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کر گزرے ہیں تو وہ زمین و آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ لیکن ہمیں کسی روایت میں اس کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ انہوں نے قرآن کے اس فیصلے پر ذرہ برابر بھی چون و چرا کی ہو۔ یہ ایسا سوال تھا جس پر غور کیا جاتا تو معاہدے کے اصل الفاظ کی جستجو کر کے اس پیچیدگی کا حل تلاش کیا جاتا، مگر بہت سے لوگوں نے تو اس کی طرف توجہ نہ کی، اور بعض حضرات (مثلاً قاضی ابوبکر ابن عربی) نے توجہ کی بھی تو انہوں نے قریش کے اعتراض نہ کرنے کی یہ توجیہ تک کرنے میں تامل نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ معجزہ اس معاملہ میں قریش کی زبان بند کر دی تھی۔ تعجب ہے کہ اس توجیہ پر ان حضرات کا ذہن کیسے مطمئن ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ معاہدۂ صلح کی یہ شرط مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ کفارِ قریش کی طرف سے تھی، اور ان کی جانب سے اُن کے نمائندے سُہیل بن عَمرو نے جو الفاظ معاہدے میں لکھوائے تھے وہ یہ تھے: علیٰ ان لا یاتیک منا رجل وان کان علی دینک الا رددتہ الینا۔ "اور یہ کہ تمہارے پاس ہم میں سے کوئی مرد بھی آئے، اگرچہ وہ تمہارے دین ہی پر ہو، تم اسے ہماری طرف واپس کرو گے"۔ معاہدے کے یہ الفاظ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحہ میں قوی سند کے ساتھ نقل ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سُہیل نے رَجُل کا لفظ شخص کے معنی میں استعمال کیا ہو، لیکن یہ اس کی ذہنی مُراد ہو گی، معاہدے میں جو لفظ لکھا گیا تھا وہ رَجُل ہی تھا جو عربی زبان میں مرد کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب امّ کلثوم بنت عُقبہ کی واپسی کا مطالبہ لے کر ان کے بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو (امام زہری کی روایت کے مطابق) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کرنے سے یہ کہہ کر انکار فرمایا کہ کان الشرط فی الرجال دون النساء۔ "شرط مردوں کے بارے میں تھی نہ کہ عورتوں کے بارے میں"۔ (احکام القرآن، ابن عربی۔ تفسیر کبیر، امام رازی)۔ اُس وقت تک خود قریش کے لوگ بھی اس غلط فہمی میں تھے کہ معاہدے کا اطلاق ہر طرح کے مہاجرین پر ہوتا ہے، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ مگر جب حضورؐ نے ان کو معاہدے کے اِن الفاظ کی طرف توجہ دلائی تو وہ دم بخود رہ گئے اور انہیں ناچار اس فیصلے کو ماننا پڑا۔

معاہدے کی اِس شرط کے لحاظ سے مسلمانوں کو حق تھا کہ جو عورت بھی مکہ چھوڑ کر مدینے آتی، خواہ وہ کسی غرض سے آتی، اسے واپس دینے سے انکار کر دیتے۔ لیکن اسلام کو صرف مومن عورتوں کی حفاظت سے دلچسپی تھی، ہر طرح کی بھاگنے والی عورتوں کے لیے مدینۂ طیبہ کو پناہ گاہ بنانا مقصود نہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے

آئیں اور اپنے مومن ہونے کا اظہار کریں، ان سے پوچھ گچھ کر کے اپنا اطمینان کر لو کہ وہ واقعی ایمان سے کر آئی ہیں، اور جب اس کا اطمینان ہو جائے تو ان کو واپس نہ کرو۔ چنانچہ اس ارشادِ الٰہی پر عملدرآمد کرنے کے لیے جو قاعدہ بنایا گیا وہ یہ تھا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آتی تھیں ان سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا وہ اللہ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتی ہیں اور صرف اللہ اور اس کے رسول کی خاطر نکل کر آئی ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ شوہر سے بگڑ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی ہوں؟ یا ہمارے ہاں کے کسی مرد کی محبت ان کو لے آئی ہو؟ یا کوئی اور دنیوی غرض ان کے اس فعل کی محرک ہوئی ہو؟ ان سوالات کا اطمینان بخش جواب جو عورتیں دے دیتی تھیں صرف ان کو روک لیا جاتا تھا، باقی سب کو واپس کر دیا جاتا تھا (ابن جریر بحوالہ ابن عباس، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن زید)۔

اِس آیت میں قانونِ شہادت کا بھی ایک اصولی ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی مزید توضیح اُس طریقِ کار سے ہو گئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عملدرآمد کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ آیت میں تین باتیں فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہجرت کرنے والی جو عورتیں اپنے آپ کو مومن ہونے کی حیثیت سے پیش کریں ان کے ایمان کی جانچ کرو۔ دوسرے یہ کہ ان کے ایمان کی حقیقت کو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، تمہارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت میں ایمان لائی ہیں۔ تیسرے یہ کہ جانچ پڑتال سے جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں واپس نہ کرو۔ پھر اس حکم کے مطابق ان عورتوں کے ایمان کی جانچ کرنے کے لیے جو طریقہ حضورؐ نے مقرر فرمایا وہ یہ تھا کہ ان عورتوں کے حلفیہ بیان پر اعتماد کیا جائے اور ضروری جرح کر کے یہ اطمینان کر لیا جائے کہ ان کی ہجرت کا محرک ایمان کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اس سے اوّل تو یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت کو حقیقت کا علم حاصل ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ صرف وہ علم کافی ہے جو شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ہم ایک شخص کے حلفیہ بیان پر اعتماد کریں گے تاوقتیکہ کوئی صریح قرینہ اس کے کاذب ہونے پر دلالت نہ کر رہا ہو۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی اپنے عقیدے اور ایمان کے متعلق خود جو خبر دے رہا ہو ہم اسے قبول کریں گے اور اس بات کی کھوج میں نہ پڑیں گے کہ فی الواقع اس کا وہی عقیدہ ہے جو وہ بیان کر رہا ہے، الاّ یہ کہ کوئی صریح علامت ہمارے سامنے ایسی ظاہر ہو جائے جو اس کی تردید کر رہی ہو۔ اور چوتھی بات یہ کہ ایک شخص کے جن ذاتی حالات کو دوسرا کوئی نہیں جان سکتا ان میں اسی کے بیان

اُن کے لیے حلال۔ ان کے کافر شوہروں نے جو مہر ان کو دیئے تھے وہ انہیں پھیر دو۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جبکہ تم اُن کے مہر اُن کو ادا کر دو[۱۵]۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیئے تھے وہ تم واپس مانگ لو اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں[۱۶]۔ یہ اللہ کا حکم ہے، وہ

پر بھروسہ کیا جائے گا، مثلاً طلاق اور عدت کے معاملات میں عورت کے حیض اور طُہر کے متعلق اس کا اپنا بیان ہی معتبر ہو گا، خواہ وہ جھوٹ بولے یا سچ۔ انہی قواعد کے مطابق علم حدیث میں بھی اُن روایات کو قبول کیا جائے گا جن کے راویوں کا ظاہر حال ان کے راستباز ہونے کی شہادت دے رہا ہو، الّا یہ کہ کچھ دوسرے قرائن ایسے موجود ہوں جو کسی روایت کے قبول میں مانع ہوں۔

۱۵ مطلب یہ ہے کہ اُن کے کافر شوہروں کو ان کے جو مہر واپس کیے جائیں گے وہی اِن عورتوں کے مہر شمار نہ ہوں گے، بلکہ اب جو مسلمان بھی ان میں سے کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے وہ اُس کا مہر ادا کرے اور اس سے نکاح کرلے۔

۱۶ اِن آیات میں چار بڑے اہم حکم بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق اسلام کے عائلی قانون سے بھی ہے اور بین الاقوامی قانون سے بھی:

اوّل یہ کہ جو عورت مسلمان ہو جائے وہ اپنے کافر شوہر کے لیے حلال نہیں رہتی اور نہ کافر شوہر اس کے لیے حلال رہتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جو منکوحہ عورت مسلمان ہو کر دارالکفر سے دارالاسلام میں ہجرت کر آئے اس کا نکاح آپ سے آپ ٹوٹ جاتا ہے اور جو مسلمان بھی چاہے اس کا مہر دے کر اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ جو مرد مسلمان ہو جائے اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی بیوی اگر کافر ہے تو وہ اسے اپنے نکاح میں روکے رکھے۔

چوتھے یہ کہ اگر دارالکفر اور دارالاسلام کے درمیان صلح کے تعلقات موجود ہوں تو اسلامی حکومت کو دارالکفر کی حکومت سے یہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کفار کی جو منکوحہ عورتیں مسلمان ہو کر دارالاسلام

میں ہجرت کر آئی ہوں ان کے مہر مسلمانوں کی طرف سے واپس دے دیئے جائیں، اور مسلمانوں کی منکوحہ کافر عورتیں جو دار الکفر میں رہ گئی ہوں ان کے مہر کفار کی طرف سے واپس مل جائیں۔

ان احکام کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ آغاز اسلام میں بکثرت مرد ایسے تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا مگر ان کی بیویاں مسلمان نہ ہوئیں۔ اور بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو مسلمان ہوگئیں مگر ان کے شوہروں نے اسلام قبول نہ کیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص غیر مسلم تھے اور کئی سال تک غیر مسلم رہے۔ ابتدائی دور میں ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ مسلمان عورت کے لیے اس کا کافر شوہر اور مسلمان مرد کے لیے اس کی مشرک بیوی حلال نہیں ہے۔ اس لیے ان کے درمیان ازدواجی رشتے برقرار رہے۔ ہجرت کے بعد بھی کئی سال تک یہ صورتِ حال رہی کہ بہت سی عورتیں مسلمان ہو کر ہجرت کر آئیں اور ان کے کافر شوہر دار الکفر میں رہے۔ اور بہت سے مسلمان مرد ہجرت کر کے آگئے اور ان کی کافر بیویاں دار الکفر میں رہ گئیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے درمیان رشتہ ازدواج قائم رہا۔ اس سے خاص طور پر عورتوں کے لیے بڑی پیچیدگی پیدا ہو رہی تھی، کیونکہ مرد تو دوسرے نکاح بھی کر سکتے تھے، مگر عورتوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ جب تک سابق شوہروں سے ان کا نکاح فسخ نہ ہوجاتے وہ کسی اور شخص سے نکاح کر سکیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب یہ آیات نازل ہوئیں تو انہوں نے مسلمانوں اور کفار و مشرکین کے درمیان سابق کے ازدواجی رشتوں کو ختم کر دیا اور آئندہ کے لیے ان کے بارے میں ایک قطعی اور واضح قانون بنا دیا۔ فقہائے اسلام نے اس قانون کو چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے:

ایک، وہ حالت جس میں زوجین دار الاسلام میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

دوسرے، وہ حالت جس میں زوجین دار الکفر میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

تیسرے، وہ حالت جس میں زوجین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو کر دار الاسلام میں ہجرت کر کے آجاتے اور دوسرا دار الکفر میں کافر رہے۔

چوتھے، وہ حالت جس میں مسلم زوجین میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے۔

ذیل میں ہم ان چاروں حالتوں کے متعلق فقہاء کے مسالک الگ الگ بیان کرتے ہیں:

(۱) پہلی صورت میں اگر اسلام شوہر نے قبول کیا ہو اور اس کی بیوی عیسائی یا یہودی ہو اور وہ اپنے

دین پر قائم رہے تو دونوں کے درمیان نکاح باقی رہے گا، کیونکہ مسلمان مرد کے لیے اہل کتاب بیوی جائز ہے۔ یہ امر تمام فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔

اور اگر اسلام قبول کرنے والے مرد کی بیوی غیر اہلِ کتاب میں سے ہو اور وہ اپنے دین پر قائم رہے، تو حنفیہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، قبول کرے تو نکاح باقی رہے گا، نہ قبول کرے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ اس صورت میں اگر زوجین کے درمیان خلوت ہو چکی ہو تو عورت مہر کی مستحق ہو گی، اور خلوت نہ ہوئی ہو تو اس کو مہر پانے کا حق نہ ہو گا، کیونکہ فرقت اُس کے انکار کی وجہ سے واقع ہوئی ہے (المبسوط، ہدایہ، فتح القدیر)۔ امام شافعی اور امام احمد کہتے ہیں کہ اگر زوجین کے درمیان خلوت نہ ہوئی ہو تو مرد کے اسلام قبول کرتے ہی عورت اس کے نکاح سے باہر ہو جائیگی، اور اگر خلوت ہو چکی ہو تو عورت تین مرتبہ ایّام ماہواری آنے تک اس کے نکاح میں رہے گی، اس دوران میں وہ خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کرے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ تیسری بار ایّام سے فارغ ہوتے ہی آپ سے آپ فسخ ہو جائے گا۔ امام شافعیؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ذمّیوں کو اُن کے مذہب سے تعرّض نہ کرنے کی جو ضمانت ہماری طرف سے دی گئی ہے اس کی بنا پر یہ درست نہیں ہے کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک کمزور بات ہے، کیونکہ ایک ذمّی عورت کے مذہب سے تعرّض تو اس صورت میں ہو گا جبکہ اس کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اُس سے صرف یہ کہنا کوئی بے جا تعرّض نہیں ہے کہ تُو اسلام قبول کرے تو اپنے شوہر کے ساتھ رہ سکے گی ورنہ تجھے اس سے الگ کر دیا جائے گا۔ حضرت علیؓ کے زمانے میں اس کی نظیر پیش بھی آ چکی ہے۔ عراق کے ایک مجوسی زمیندار نے اسلام قبول کیا اور اس کی بیوی کافر رہی۔ حضرت علیؓ نے اس کے سامنے اسلام پیش فرمایا۔ اور جب اس نے انکار کیا تب آپ نے دونوں کے درمیان تفریق کرا دی (المبسوط)۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر خلوت نہ ہو چکی ہو تو مرد کے اسلام لاتے ہی اس کی کافر بیوی اس سے فوراً جُدا ہو جائے گی اور اگر خلوت ہو چکی ہو تو عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا اور اس کے انکار کی صورت میں جدائی واقع ہو جائے گی (المغنی لابنِ قُدامہ)۔

اور اگر اسلام قبول کرنے والی عورت ہو اور مرد کافر رہے، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہو یا غیر اہلِ کتاب

ہیں سے، تو حنفیہ کہتے ہیں کہ خواہ دونوں میں خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو، ہر صورت میں شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، قبول کرے تو عورت اس کے نکاح میں رہے گی، انکار کر دے تو قاضی دونوں میں تفریق کرا دے گا۔ اس دوران میں جب تک مرد اسلام سے انکار نہ کرے، عورت اس کی بیوی تو رہے گی مگر اس کو مقاربت کا حق نہ ہو گا۔ شوہر کے انکار کی صورت میں تفریق طلاقِ بائن کے حکم میں ہو گی۔ اگر اس سے پہلے خلوت نہ ہوئی ہو تو عورت نصف مہر پانے کی حق دار ہو گی، اور خلوت ہو چکی ہو تو عورت پورا مہر بھی پائے گی اور عدّت کا نفقہ بھی (المبسوط۔ ہدایہ فتح القدیر)۔ امام شافعیؒ کے نزدیک خلوت نہ ہونے کی صورت میں عورت کے اسلام قبول کرتے ہی نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت ہونے کی صورت میں عدت ختم ہونے تک عورت اس مرد کے نکاح میں رہے گی۔ اس مدت کے اندر وہ اسلام قبول کرلے تو نکاح باقی رہے گا ورنہ عدت گزرتے ہی جُدائی واقع ہو جائے گی۔ لیکن مرد کے معاملہ میں بھی امام شافعیؒ نے وہی رائے ظاہر کی ہے جو عورت کے معاملہ میں اوپر منقول ہوئی کہ اس کے سامنے اسلام پیش کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ مسلک بہت کمزور ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ عورت نے اسلام قبول کر لیا اور مرد سے اسلام لانے کے لیے کہا گیا اور جب اس نے انکار کر دیا تو دونوں کے درمیان تفریق کرادی گئی۔ مثلاً بنی تغلب کے ایک عیسائی کی بیوی کا معاملہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے مرد سے کہا یا تو تُو اسلام قبول کرلے ورنہ مَیں تم دونوں کے درمیان تفریق کر دوں گا۔ اس نے انکار کیا اور آپ نے تفریق کی ڈگری دے دی۔ بہز الملک کی ایک نومسلم زمیندارنی کا مقدمہ ان کے پاس بھیجا گیا۔ اس کے معاملہ میں بھی انہوں نے حکم دیا کہ اس کے شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اگر وہ قبول کرلے تو بہتر، ورنہ دونوں میں تفریق کرادی جائے۔ یہ واقعات صحابہ کرام کے سامنے پیش آئے تھے اور کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص۔ المبسوط۔ فتح القدیر)۔ امام مالکؒ کی رائے اس معاملے میں یہ ہے کہ اگر خلوت سے پہلے عورت مسلمان ہو جائے تو شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، وہ قبول کرے تو بہتر ورنہ فوراً تفریق کرادی جائے۔ اور اگر خلوت ہو چکی ہو اور اس کے بعد عورت اسلام لائی ہو تو زمانۂ عدت ختم ہونے تک انتظار کیا جائے۔ اس مدت میں شوہر اسلام قبول کرلے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ عدت گزرتے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام احمدؒ کا ایک قول امام شافعیؒ کی تائید میں ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ زوجین کے درمیان اختلافِ دین واقع ہو جانا بہر حال فوری تفریق کا موجب ہے خواہ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو (المغنی)۔

(۲) دار الکفر میں اگر عورت مسلمان ہو جائے اور مرد کافر رہے، یا مرد مسلمان ہو جائے اور اس کی بیوی (جو عیسائی یا یہودی نہ ہو بلکہ کسی غیر کتابی مذہب کی ہو) اپنے مذہب پر قائم رہے، تو حنفیہ کے نزدیک خواہ ان کے

درمیان خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، تفریق واقع نہ ہوگی جب تک عورت کو تین مرتبہ ایام ماہواری نہ آجائیں، یا اس کے غیر حائضہ ہونے کی صورت میں تین مہینے نہ گزر جائیں۔ اس دوران میں اگر دوسرا فریق بھی مسلمان ہو جائے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ یہ مدت گزرتے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام شافعیؒ اس معاملہ میں بھی خلوت اور عدمِ خلوت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اگر خلوت نہ ہوئی ہو تو زوجین کے درمیان دین کا اختلاف واقع ہوتے ہی فرقت ہو جاتی ہے، اور اگر خلوت ہو جانے کے بعد دین کا اختلاف رونما ہوا ہو تو عدت کی مدت ختم ہونے تک ان کا نکاح باقی رہے گا۔ اس دوران میں اگر دوسرا فریق اسلام قبول نہ کرے تو عدت ختم ہونے کے ساتھ ہی نکاح بھی ختم ہو جائے گا (المبسوط، فتح القدیر، احکام القرآن للجصاص)۔

(۳) جس صورت میں زوجین کے درمیان اختلافِ دین کے ساتھ اختلافِ دار بھی واقع ہو جائے، یعنی ان میں سے کوئی ایک دارالکفر میں کافر رہے اور دوسرا دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جائے، اس کے متعلق حنفیہ کہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان نکاح کا تعلق آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ اگر ہجرت کرنے والی عورت ہو تو اسے فوراً دوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہے، اس پر کوئی عدت نہیں ہے، البتہ مقاربت کے لیے اس کے شوہر کو استبراءِ رحم کی خاطر ایک مرتبہ ایامِ ماہواری آجانے تک انتظار کرنا ہوگا، اور اگر وہ حاملہ ہو تب بھی نکاح ہو سکتا ہے مگر مقاربت کے لیے وضعِ حمل تک انتظار کرنا ہوگا۔ امام ابویوسف اور امام محمد نے اس مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ سے صرف اتنا اختلاف کیا ہے کہ ان کے نزدیک عورت پر عدت لازم ہے، اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضعِ حمل سے پہلے اس کا نکاح نہیں ہو سکتا (المبسوط۔ ہدایہ۔ احکام القرآن للجصاص)۔ امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اختلافِ دار کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ اصل چیز صرف اختلافِ دین ہے۔ یہ اختلاف اگر زوجین میں واقع ہو جائے تو احکام وہی ہیں جو دارالاسلام میں زوجین کے درمیان یہ اختلاف واقع ہونے کے احکام ہیں (المغنی)۔ امام شافعیؒ اپنی مذکورۂ بالا رائے کے ساتھ ساتھ ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورت کے معاملہ میں یہ رائے بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کافر شوہر سے لڑ کر اس کے حقِ زوجیت کو ساقط کرنے کے ارادے سے آئی ہو، تو اختلافِ دار کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اِس قصد کی بنا پر فوراً فرقت واقع ہو جائے گی (المبسوط و ہدایہ)۔

لیکن قرآن مجید کی زیرِ بحث آیت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملہ صحیح ترین رائے وہی ہے

جو امام ابوحنیفہؒ نے ظاہر فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہجرت کرکے آنے والی مومن عورتوں ہی کے بارے میں نازل فرمائی ہے اور انہی کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے اُن کافر شوہروں کے لیے حلال نہیں رہیں جنہیں وہ دارالکفر میں چھوڑ آئی ہیں اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو اجازت ہے کہ وہ ان کے مہر ادا کرکے ان سے نکاح کر لیں۔ دوسری طرف مہاجر مسلمانوں سے خطاب کرکے یہ فرمایا ہے کہ اپنی اُن کافر بیویوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو جو دارالکفر میں رہ گئی ہیں اور کفار سے اپنے وہ مہر واپس مانگ لو جو تم نے ان عورتوں کو دیئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف اختلافِ دین ہی کے احکام نہیں ہیں بلکہ اِن احکام کو جس چیز نے یہ خاص شکل دی ہے وہ اختلافِ دار ہے۔ اگر ہجرت کی بنا پر مسلمان عورتوں کے نکاح ان کے کافر شوہروں سے ٹوٹ نہ گئے ہوتے تو مسلمانوں کو ان سے نکاح کر لینے کی اجازت کیسے دی جاسکتی تھی اور وہ بھی اِس طرح کہ اس اجازت میں عدت کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ اسی طرح اگر لاتمسکوا بعصم الکوافر کا حکم آجانے کے بعد بھی مسلمان مہاجرین کی کافر بیویاں ان کے نکاح میں باقی رہ گئی ہوتیں تو ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا جاتا کہ انہیں طلاق دے دو، مگر یہاں اس کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت طلحہؓ اور بعض دوسرے مہاجرین نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی تھی، مگر یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اُن کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا اور ان بیویوں کے ساتھ تعلقِ زوجیت کا انقطاع اُن کے طلاق دینے پر موقوف تھا، اور اگر وہ طلاق نہ دیتے تو وہ بیویاں اُن کے نکاح میں باقی رہ جاتیں۔

اس کے جواب میں عہدِ نبوی کے تین واقعات کی نظیریں پیش کی جاتی ہیں جن کو اس امر کا ثبوت قرار دیا جاتا ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلافِ دار کے باوجود مومن اور کافر زوجین کے درمیان نکاح کا تعلق برقرار رکھا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ فتح مکّہ سے ذرا پہلے ابوسفیان مَرُّالظَّہران (موجودہ وادی فاطمہ) کے مقام پر لشکرِ اسلام میں آتے اور یہاں انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور ان کی بیوی ہند مکّہ میں کافر رہیں۔ پھر فتح مکّہ کے بعد ہند نے اسلام قبول کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدیدِ نکاح کے بغیر ہی اُن کو سابق نکاح پر برقرار رکھا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ فتح مکّہ کے بعد عکرمہ بن ابی جہل اور حکیم بن حزام مکّہ سے فرار ہو گئے اور ان کے پیچھے دونوں کی بیویاں مسلمان ہو گئیں۔ پھر انہوں نے حضورؐ سے اپنے شوہروں کے لیے امان لے لی اور جاکر ان کو لے آئیں۔ دونوں اصحاب

نے حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھی سابق نکاحوں کو برقرار رکھا تیسرا واقعہ حضورؐ کی اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا ہے جو ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئی تھیں اور ان کے شوہر ابوالعاص بحالت کفر مکہ ہی میں مقیم رہ گئے تھے۔ ان کے متعلق مُسند احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ابن عباس کی روایت یہ ہے کہ وہ ۸ھ میں مدینہ آکر مسلمان ہوئے اور حضورؐ نے تجدیدِ نکاح کے بغیر سابق نکاح ہی پر صاحبزادی کو ان کی زوجیت میں رہنے دیا۔ لیکن ان میں سے پہلے دو واقعے تو درحقیقت اختلافِ دار کی تعریف ہی میں نہیں آتے کیونکہ اختلافِ دار اس چیز کا نام نہیں ہے کہ ایک شخص عارضی طور پر ایک دار سے دوسرے دار کی طرف چلا گیا یا فرار ہو گیا، بلکہ یہ اختلاف صرف اس صورت میں واقع ہوتا ہے جب کوئی آدمی ایک دار سے منتقل ہو کر دوسرے دار میں آباد ہو جائے اور اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق "قومیت" (NATIONALITY) کا فرق واقع ہو جائے۔ رہا سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا معاملہ تو اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت ابن عباس کی ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، اور دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عَمرو بن عاص کی ہے جس کو امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اس دوسری روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبزادی کو جدید نکاح اور جدید مہر کے ساتھ پھر ابوالعاص ہی کی زوجیت میں دے دیا۔ اس اختلافِ روایت کی صورت میں اول تو یہ نظیر اُن حضرات کے لیے قطعی دلیل نہیں رہتی جو اختلافِ دار کی قانونی تاثیر کا انکار کرتے ہیں۔ دوسرے، اگر وہ ابن عباس ہی کی روایت کے صحیح ہونے پر اصرار کریں تو یہ ان کے مسلک کے خلاف پڑتی ہے، کیونکہ ان کے مسلک کی رُو سے جن میاں بیوی کے درمیان اختلافِ دین واقع ہو گیا ہو اور وہ باہم خلوت کر چکے ہوں ان کا نکاح عورت کو صرف تین ایام ماہواری آنے تک باقی رہے گا، اس دوران میں دوسرا فریق اسلام قبول کرے تو زوجیت قائم رہے گی، ورنہ تیسری بار ایام آتے ہی نکاح آپ سے آپ فسخ ہو جائے گا۔ لیکن حضرت زینب کے جس واقعہ سے وہ استدلال کرتے ہیں اس میں زوجین کے درمیان اختلافِ دین واقع ہوئے کئی سال گزر چکے تھے، حضرت زینب کی ہجرت کے چھ سال بعد ابوالعاص ایمان لائے تھے، اور ان کے ایمان لانے سے کم از کم دو سال پہلے قرآن میں وہ حکم نازل ہو چکا تھا جس کی رُو سے مسلمان عورت مشرکین پر حرام کر دی گئی تھی۔

(۴) چوتھا مسئلہ ارتداد کا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مرتد ہو اور دوسرا مسلمان رہے۔

اگر زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں تو شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ خلوت سے پہلے ایسا ہو تو فوراً، اور خلوت کے بعد ہو تو عدت کی مدت ختم ہوتے ہی دونوں کا وہ نکاح ختم ہو جائے گا جو حالت اسلام میں ہوا تھا۔ اس کے برعکس حنفیہ کہتے ہیں کہ اگرچہ قیاس یہی کہتا ہے کہ ان کا نکاح فسخ ہو جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جو فتنۂ ارتداد برپا ہوا تھا اس میں ہزارہا آدمی مرتد ہوئے، پھر مسلمان ہو گئے، اور صحابہ کرام نے کسی کو بھی تجدید نکاح کا حکم نہیں دیا، اس لیے ہم صحابہ کے متفقہ فیصلے کو قبول کرتے ہوئے خلاف قیاس یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ زوجین کے ایک ساتھ مرتد ہونے کی صورت میں ان کے نکاح نہیں ٹوٹتے (مبسوط۔ ہدایہ۔ فتح القدیر۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

اگر شوہر مرتد ہو جائے اور عورت مسلمان رہے تو حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک فوراً نکاح ٹوٹ جائے گا، خواہ ان کے درمیان پہلے خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ لیکن شافعیہ اور حنابلہ اس میں خلوت سے پہلے اور خلوت کے بعد کی حالت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ اگر خلوت سے پہلے ایسا ہوا ہو تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت کے بعد ہوا ہو تو زمانہ عدت تک باقی رہے گا، اس دوران میں وہ شخص مسلمان ہو جائے تو زوجیت برقرار رہے گی، ورنہ عدت ختم ہوتے ہی اس کے ارتداد کے وقت سے نکاح فسخ شدہ شمار کیا جائے گا، یعنی عورت کو پھر کوئی نئی عدت گزارنی نہ ہو گی۔ چاروں فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ خلوت سے پہلے یہ معاملہ پیش آیا ہو تو عورت کو نصف مہر، اور خلوت کے بعد پیش آیا تو پورا مہر پانے کا حق ہو گا۔

اور اگر مرتد ہونے والی عورت ہو تو اس کے بارے میں حنفیہ کا قدیم فتویٰ یہ تھا کہ اس صورت میں بھی نکاح فسخ ہو جائے گا، لیکن بعد کے دور میں علمائے بلخ و سمرقند نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت کے مرتد ہونے سے فوراً فرقت واقع نہیں ہوتی اور اس سے ان کا مقصد اس امر کی روک تھام کرنا تھا کہ شوہروں سے پیچھا چھڑانے کے لیے عورتیں کہیں ارتداد کا راستہ اختیار نہ کرنے لگیں۔ مالکیہ کا فتویٰ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر قرائن یہ بتا رہے ہوں کہ عورت نے محض شوہر سے علیحدگی حاصل کرنے کے لیے بطور حیلہ ارتداد اختیار کیا ہے تو فرقت واقع نہ ہو گی۔ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ عورت کے ارتداد کی صورت میں بھی قانون وہی ہے جو مرد کے ارتداد کی صورت میں

تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور اگر تمہاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے کچھ تمہیں کفار سے واپس نہ ملے اور پھر تمہاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں اُدھر گئی ہیں اُن کو اتنی رقم ادا کر دو جو اُن کے دیئے ہوئے مہروں کے برابر ہو[17]۔ اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان

ہے، یعنی خلوت سے پہلے مرتد ہو تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت کے بعد ہو تو زمانہ عدت گزرنے تک نکاح باقی رہے گا، اس دوران میں وہ مسلمان ہو جائے تو زوجیت کا رشتہ برقرار رہے گا، ورنہ عدت گزرتے ہی نکاح وقتِ ارتداد سے فسخ شمار ہو گا۔ مہر کے بارے میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ خلوت سے پہلے اگر عورت مرتد ہوئی ہے تو اسے کوئی مہر نہ ملے گا، اور اگر خلوت کے بعد اس نے ارتداد اختیار کیا ہو تو وہ پورا مہر پائے گی۔ (المبسوط۔ ہدایہ۔ فتح القدیر۔ المغنی۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

۱۷؎ اس معاملہ کی دو صورتیں تھیں اور اس آیت کا انطباق دونوں صورتوں پر ہوتا ہے:

ایک صورت یہ تھی کہ جن کفار سے مسلمانوں کے معاہدانہ تعلقات تھے ان سے مسلمانوں نے یہ معاملہ طے کرنا چاہا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے ہماری طرف آگئی ہیں ان کے مہر ہم واپس کر دیں گے، اور ہمارے آدمیوں کی جو کافر بیویاں اُدھر رہ گئی ہیں اُن کے مہر تم واپس کر دو۔ لیکن انہوں نے اس بات کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ امام زُہری بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے مسلمان اُن عورتوں کے مہر واپس دینے کے لیے تیار ہو گئے جو مشرکین کے پاس مکہ میں رہ گئی تھیں، مگر مشرکوں نے ان عورتوں کے مہر واپس دینے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے پاس ہجرت کر کے آگئی تھیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مہاجر عورتوں کے جو مہر تمہیں مشرکین کو واپس کرنے ہیں وہ ان کو بھیجنے کے بجائے مدینے ہی میں جمع کر لیے جائیں اور جن لوگوں کو مشرکین سے اپنے دیئے ہوئے مہر واپس لینے ہیں اُن میں سے ہر ایک کو اتنی رقم دے دی جاتے جو اُسے کفار سے وصول ہونی چاہیے تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ جن کفار سے مسلمانوں کے معاہدانہ تعلقات نہ تھے اُن کے علاقوں سے بھی متعدد آدمی اسلام قبول کر کے دارالاسلام میں آگئے تھے اور ان کی کافر بیویاں وہاں رہ گئی تھیں۔ اسی طرح بعض عورتیں بھی مسلمان ہو کر ہجرت کر آئی تھیں اور ان کے کافر شوہر وہاں رہ گئے تھے۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ دارالاسلام ہی میں ادلے کا بدلہ چکا دیا جائے۔ جب کفار سے کوئی مہر واپس نہیں ملتا ہے تو انہیں بھی کوئی مہر

لاتے ہو۔

اے نبی، جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں[۱۸] اور اس بات کا عہد کریں

واپس نہ کیا جائے۔ اس کے بجائے جو عورت ادھر آگئی ہے اس کے بدلے کا مہر اُس شخص کو ادا کر دیا جائے جس کی بیوی اُدھر رہ گئی ہے۔

لیکن اگر اس طرح حساب برابر نہ ہو سکے، اور جن مسلمانوں کی بیویاں اُدھر رہ گئی ہیں اُن کے وصول طلب مہر ہجرت کرکے آنے والی مسلمان عورتوں کے مہروں سے زیادہ ہوں، تو حکم دیا گیا کہ اُس مالِ غنیمت سے باقی رقمیں ادا کر دی جائیں جو کفار سے لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جس شخص کے حصے کا مہر وصول طلب رہ جاتا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے کہ اس کے نقصان کی تلافی مالِ غنیمت سے کر دی جائے (ابن جریر)۔ اسی مسلک کو عطاء، مجاہد، زُہری، مسروق، ابراہیم نخعی، قتادہ، مُقاتل اور ضحاک نے اختیار کیا ہے۔ یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے مہر کفار کی طرف رہ گئے ہوں ان کا بدلہ کفار سے ہاتھ آئے ہوئے مجموعی مالِ غنیمت میں سے ادا کیا جائے، یعنی تقسیمِ غنائم سے پہلے ان لوگوں کے فوت شدہ مہران کو دے دیے جائیں، اور اس کے بعد تقسیم ہو جس میں وہ لوگ بھی دوسرے سب مجاہدین کے ساتھ برابر کا حصہ پائیں۔ بعض فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف اموالِ غنیمت ہی نہیں، اموالِ فے میں سے بھی ایسے لوگوں کے نقصان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اہلِ علم کے ایک بڑے گروہ نے اس مسلک کو قبول نہیں کیا ہے۔

[۱۸] جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ آیت فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب مکہ فتح ہوا تو قریش کے لوگ جُوق در جُوق حضورؐ سے بیعت کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ آپ نے مردوں سے کوہِ صفا پر خود بیعت لی اور حضرت عمرؓ کو اپنی طرف سے مامور فرمایا کہ وہ عورتوں سے بیعت لیں اور اُن باتوں کا اقرار کرائیں جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں (ابن جریر، بروایت ابن عباس۔ ابن ابی حاتم، بروایت قتادہ)۔ پھر مدینہ واپس تشریف لے جا کر آپ نے ایک مکان میں انصار کی خواتین کو جمع کرنے کا حکم دیا اور حضرت عمرؓ کو ان سے بیعت لینے کے لیے بھیجا (ابن جریر، ابن مَردُوْیَہ، بَزّار، ابن حِبّان، بروایت ام عطیہ انصاریہ)۔ عید کے روز بھی مردوں کے درمیان خطبہ دینے کے بعد آپ عورتوں کے مجمع کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطبہ کے دوران میں آپ نے

کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، [19] زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، [20] اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی، [21] اور کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی۔ [22]

یہ آیت تلاوت کر کے ان باتوں کا عہد لیا جو اس آیت میں مذکور ہوئی ہیں (بخاری، بروایت ابن عباس)۔ ان مواقع کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں عورتیں فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرتی رہیں جن کا ذکر متعدد احادیث میں آیا ہے۔

[19] مکہ معظمہ میں جب عورتوں سے بیعت لی جا رہی تھی اُس وقت حضرت ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عُتبہ نے اس حکم کی تشریح دریافت کرتے ہوئے حضور سے عرض کیا، یا رسول اللہ، ابوسفیان ذرا بخیل آدمی ہیں، کیا میرے اُوپر اِس میں کوئی گناہ ہے کہ میں اپنی اور اپنے بچوں کی ضروریات کے لیے ان سے پوچھے بغیر ان کے مال میں سے کچھ لے لیا کروں؟ آپ نے فرمایا نہیں، مگر بس معروف کی حد تک۔ یعنی بس اتنا مال لے لو جو فی الواقع جائز ضروریات کے لیے کافی ہو۔ (احکام القرآن، ابن عربی)

[20] اس میں اسقاطِ حمل بھی شامل ہے، خواہ وہ جائز حمل کا اسقاط ہو یا ناجائز حمل کا۔

[21] اس سے دو قسم کے بہتان مراد ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی عورت دوسری عورتوں پر غیر مردوں سے آشنائی کی تہمتیں لگائے اور اس طرح کے قصے لوگوں میں پھیلائے، کیونکہ عورتوں میں خاص طور پر ان باتوں کے چرچے کرنے کی بیماری پائی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک عورت بچہ تو کسی کا جنے اور شوہر کو یقین دلائے کہ یہ تیرا ہی ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جو عورت کسی خاندان میں کوئی ایسا بچہ گھسا لائے جو اس خاندان کا نہیں ہے اس کا اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، اور اللہ اُسے کبھی جنت میں داخل نہ کرے گا۔"

[22] اِس مختصر سے فقرے میں دو بڑے اہم قانونی نکات بیان کیے گئے ہیں۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر بھی اطاعت فی المعروف کی قید لگائی گئی ہے، حالانکہ حضورؐ کے بارے میں اس امر کے کسی ادنیٰ شبہ کی گنجائش بھی نہ تھی کہ آپ کبھی مُنکر کا حکم بھی دے سکتے ہیں۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو گئی کہ دنیا میں کسی مخلوق کی اطاعت قانونِ خداوندی کے حدود سے باہر جا کر نہیں کی جا سکتی۔

کیونکہ جب خدا کے رسول تک کی اطاعت معروف کی شرط سے مشروط ہے تو پھر کسی دوسرے کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ اسے غیر مشروط اطاعت کا حق پہنچے اور اس کے کسی ایسے حکم یا قانون یا ضابطے اور رسم کی پیروی کی جائے جو قانونِ خداوندی کے خلاف ہو۔ اِس قاعدے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :
لا طاعة فی معصیة اللہ ، انما الطاعة فی المعروف "اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے، اطاعت صرف معروف میں ہے" (مسلم، ابوداؤد، نسائی)۔ یہی مضمون اکابر اہلِ علم نے اس آیت سے مستنبط کیا ہے حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں :

"اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ تمہاری نافرمانی نہ کریں، بلکہ فرمایا یہ ہے کہ وہ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے نبیؐ تک کی اطاعت کو اس شرط سے مشروط کیا ہے تو کسی اور شخص کے لیے یہ کیسے سزاوار ہو سکتا ہے کہ معروف کے سوا کسی معاملہ میں اس کی اطاعت کی جائے" (ابن جریر)۔

امام ابوبکر جصّاص لکھتے ہیں :

"اللہ کو معلوم تھا کہ اُس کا نبی کبھی معروف کے سوا کسی چیز کا حکم نہیں دیتا، پھر بھی اس نے اپنے نبی کی نافرمانی سے منع کرتے ہوئے معروف کی شرط لگا دی تاکہ کوئی شخص کبھی اس امر کی گنجائش نہ نکال سکے کہ ایسی حالت میں بھی سلاطین کی اطاعت کی جائے جبکہ ان کا حکم اللہ کی اطاعت میں نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ من اطاع مخلوقاً فی معصیة الخالق سلط اللہ علیہ ذالك المخلوق ، یعنی جو شخص خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت کرے، اللہ تعالیٰ اس پر اسی مخلوق کو مسلط کر دیتا ہے" (احکام القرآن)۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں :

"یہ ارشاد اُن جاہلوں کے خیال کی تردید کرتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ اولی الامر کی اطاعت مطلقاً لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو رسول کی اطاعت پر بھی معروف کی قید لگا دی ہے، حالانکہ رسول کبھی معروف کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا۔ اس سے مقصود لوگوں کو خبردار کرنا ہے کہ خالق کی معصیت

میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے" (روح المعانی)

پس درحقیقت یہ ارشاد اسلام میں قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) کا سنگِ بنیاد ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ ہر کام جو اسلامی قانون کے خلاف ہو، جرم ہے اور کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ ایسے کسی کام کا کسی کو حکم دے۔ جو شخص بھی خلافِ قانون حکم دیتا ہے وہ خود مجرم ہے، اور جو شخص اس حکم کی تعمیل کرتا ہے وہ بھی مجرم ہے۔ کوئی ماتحت اس عذر کی بنا پر سزا سے نہیں بچ سکتا کہ اس کے افسر بالا نے اسے ایک ایسے فعل کا حکم دیا تھا جو قانون میں جرم ہے۔

دوسری بات جو آئینی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ اس آیت میں پانچ منفی احکام دینے کے بعد مثبت حکم صرف ایک ہی دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تمام نیک کاموں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت کی جائے گی۔ جہاں تک برائیوں کا تعلق ہے، وہ بڑی بڑی برائیاں گنا دی گئیں جن میں زمانہ جاہلیت کی عورتیں مبتلا تھیں اور ان سے باز رہنے کا عہد لے لیا گیا، مگر جہاں تک بھلائیوں کا تعلق ہے اُن کی کوئی فہرست دے کر عہد نہیں لیا گیا کہ تم فلاں فلاں اعمال کرو گی بلکہ صرف یہ عہد لیا گیا کہ جس نیک کام کا بھی حضورؐ حکم دیں گے اس کی پیروی تمہیں کرنی ہو گی۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ نیک اعمال صرف وہی ہوں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دیا ہے تو عہد ان الفاظ میں لیا جانا چاہیے تھا کہ "تم اللہ کی نافرمانی نہ کرو گی" یا یہ کہ "تم قرآن کے احکام کی نافرمانی نہ کرو گی"۔ لیکن جب عہد ان الفاظ میں لیا گیا کہ "جس نیک کام کا حکم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیں گے تم اس کی خلاف ورزی نہ کرو گی"، تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے حضورؐ کو وسیع ترین اختیارات دیئے گئے ہیں اور آپ کے تمام احکام واجب الاطاعت ہیں خواہ وہ قرآن میں موجود ہوں یا نہ ہوں۔

اسی آئینی اختیار کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لیتے ہوئے اُن بہت سی برائیوں کے چھوڑنے کا عہد لیا جو اُس وقت عرب معاشرے کی عورتوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور متعدد ایسے احکام دیئے جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ اس کے لیے حسبِ ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

ابن عباسؓ، امّ سلمہؓ اور امّ عطیہؓ انصاریہ وغیرہ کی روایات ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لیا کہ وہ مرنے والوں پر نوحہ نہ کریں گی۔ یہ روایات بخاری، مسلم، نسائی اور ابن جریر

نے نقل کی ہیں۔

ابن عباسؓ کی ایک روایت میں یہ تفصیل ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو عورتوں سے بیعت لینے کے لیے مامور کیا اور حکم دیا کہ ان کو نوحہ کرنے سے منع کریں، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں عورتیں مرنے والوں پر نوحہ کرتے ہوئے کپڑے پھاڑتی تھیں منہ نوچتی تھیں، بال کاٹتی تھیں اور سخت واویلا مچاتی تھیں (ابن جریر)۔

زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ آپ نے بیعت لیتے وقت عورتوں کو اس سے منع کیا کہ وہ مرنے والوں پر نوحہ کرتے ہوئے اپنے منہ نوچیں اور گریبان پھاڑیں اور واویلا کریں اور شعر گا گا کر بین کریں (ابن جریر)۔ اسی کی ہم معنی ایک روایت ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ایک ایسی خاتون سے نقل کی ہے جو بیعت کرنے والیوں میں شامل تھیں۔

قتادہ اور حسن بصری رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ جو عہد حضورؐ نے بیعت لیتے وقت عورتوں سے لیے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ غیر محرم مردوں سے بات نہ کریں گی۔ ابن عباس کی روایت میں اس کی یہ وضاحت ہے کہ غیر مردوں سے تخلیہ میں بات نہ کریں گی۔ قتادہ نے مزید وضاحت یہ کی ہے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد سُن کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے عرض کیا یا رسول اللہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم گھر پر نہیں ہوتے اور ہمارے ہاں کوئی صاحب ملنے آجاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میری مراد یہ نہیں ہے۔ یعنی عورت کا کسی آنے والے سے اتنی بات کہہ دینا ممنوع نہیں ہے کہ صاحبِ خانہ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ (یہ روایات ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے نقل کی ہیں)۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خالہ اُمیمہؓ بنت رُقیقہ سے حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے ان سے یہ عہد لیا کہ نوحہ نہ کرنا اور جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار کر کے اپنی نمائش نہ کرنا (مسند احمد۔ ابن جریر)۔

حضورؐ کی ایک خالہ سلمیٰ بنت قیس کہتی ہیں کہ مَیں انصار کی چند عورتوں کے ساتھ بیعت کے لیے حاضر ہوئی تو آپ نے قرآن کی اس آیت کے مطابق ہم سے عہد لیا، پھر فرمایا ولا تغششن ازواجکن "اپنے شوہروں سے دھوکے بازی نہ کرنا"۔ جب ہم واپس ہونے لگیں تو ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ جا کر حضورؐ سے پوچھو شوہروں سے دھوکے بازی کرنے کا کیا مطلب ہے۔ مَیں نے جا کر پوچھا تو آپؐ نے فرمایا تاخذ مالہ فتحابی بہ غیرہ "یہ کہ تو اس کا مال لے اور دوسروں پر لٹائے" (مسند احمد)۔

اُم عطیہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے بیعت لینے کے بعد ہمیں حکم دیا کہ ہم عیدین کی جماعت میں حاضر ہوا کریں گی البتہ جمعہ ہم پر فرض نہیں ہے، اور جنازوں کے ساتھ جانے سے ہمیں منع فرما دیا (ابن جریر)۔

تو ان سے بیعت لے لو[۲۳] اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جو لوگ حضورؐ کے اِس آئینی اختیار کو آپ کی حیثیت رسالت کے بجائے حیثیتِ امارت سے متعلق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ چونکہ اپنے وقت کے حکمراں بھی تھے اس لیے اپنی اس حیثیت میں آپ نے جو احکام دیئے وہ صرف آپ کے زمانے تک ہی واجب الاطاعت تھے، وہ بڑی جہالت کی بات کہتے ہیں۔ اوپر کی سطور میں ہم نے حضورؐ کے جو احکام نقل کیے ہیں ان پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ ان میں عورتوں کی اصلاح کے لیے جو ہدایات آپ نے دی ہیں وہ اگر محض حاکمِ وقت ہونے کی حیثیت سے ہوتیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پوری دنیا کے مسلم معاشرے کی عورتوں میں یہ اصلاحات کیسے رائج ہو سکتی تھیں؟ آخر دنیا کا وہ کونسا حاکم ہے جس کو یہ مرتبہ حاصل ہو کہ ایک مرتبہ اس کی زبان سے ایک حکم صادر ہو اور روئے زمین پر جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں وہاں کے مسلم معاشرے میں ہمیشہ کے لیے وہ اصلاح رائج ہو جائے جس کا حکم اس نے دیا ہے؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ حشر، حاشیہ ۱۵)

۲۳ے معتبر اور متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ مردوں کی بیعت سے مختلف تھا۔ مردوں سے بیعت لینے کا طریقہ یہ تھا کہ بیعت کرنے والے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہد کرتے تھے۔ لیکن عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے آپ نے کبھی کسی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، بلکہ مختلف دوسرے طریقے اختیار فرمائے۔ اس کے بارے میں جو روایات منقول ہوئی ہیں وہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ "خدا کی قسم بیعت میں حضورؐ کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ سے چھوا تک نہیں ہے۔ آپ عورت سے بیعت لیتے ہوئے بس زبانِ مبارک سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تجھ سے بیعت لی" (بخاری، ابن جریر)

اُمیمہ بنت رُقیقہ کا بیان ہے کہ میں اور چند عورتیں حضورؐ کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئیں اور آپؐ نے قرآن کی اس آیت کے مطابق ہم سے عہد لیا۔ جب ہم نے کہا "ہم معروف میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی" تو آپ نے فرمایا فیما استطعتن واطقتن "جہاں تک تمہارے بس میں ہو اور تمہارے لیے ممکن ہو"۔ ہم نے عرض کیا "اللہ اور اس کا رسول ہمارے لیے خود ہم سے بڑھ کر رحیم ہیں"۔ پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہاتھ بڑھائیے

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، اُن لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے۔ جو آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر مایوس ہیں[۲۲] ع ۲

تاکہ ہم آپ سے بیعت کریں۔ آپ نے فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، بس میں تم سے عہد لوں گا۔ چنانچہ آپ نے عہد لے لیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ہم میں سے کسی عورت سے بھی مصافحہ نہیں کیا (مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، ابن ابی حاتم)

ابوداؤد نے مراسیل میں شعبی کی روایت نقل کی ہے کہ عورتوں سے بیعت لیتے وقت ایک چادر حضورؐ کی طرف بڑھائی گئی۔ آپؐ نے بس اسے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ یہی مضمون ابن ابی حاتم نے شعبی سے، عبدالرزاق نے ابراہیم نخعی سے اور سعید بن منصور نے قیس بن ابی حازم سے نقل کیا ہے۔

ابن اسحاق نے مغازی میں ابان بن صالح سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ پانی کے ایک برتن میں ہاتھ ڈال دیتے تھے، اور پھر اسی برتن میں عورت بھی اپنا ہاتھ ڈال دیتی تھی۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ عید کا خطبہ دینے کے بعد آپ مردوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ نے وہاں اپنی تقریر میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی، پھر عورتوں سے پوچھا تم اس کا عہد کرتی ہو؟ مجمع میں سے ایک عورت نے جواب دیا ہاں یا رسول اللہ۔

ایک روایت میں جسے ابن حبان، ابن جریر اور بزار وغیرہ نے نقل کیا ہے، ام عطیہ انصاریہ کا یہ بیان ملتا ہے کہ "حضورؐ نے گھر کے باہر سے ہاتھ بڑھایا اور ہم نے اندر سے ہاتھ بڑھائے"، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورتوں نے آپؐ سے مصافحہ بھی کیا ہو، کیونکہ حضرت ام عطیہ نے مصافحہ کی تصریح نہیں کی ہے۔ غالباً اس موقع پر صورت یہ رہی ہوگی کہ عہد لیتے وقت آپ نے باہر سے ہاتھ بڑھایا ہوگا اور اندر سے عورتوں نے اپنے اپنے ہاتھ آپؐ کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیئے ہوں گے بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے مس ہوا۔

[۲۲] اصل الفاظ ہیں قَدْ یَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَۃِ کَمَا یَئِسَ الْکُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آخرت کی بھلائی اور اس کے ثواب سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح زندگی بعد موت سے انکار کرنے والے اس بات سے مایوس ہیں کہ ان کے جو عزیز رشتہ دار قبروں میں جا چکے ہیں وہ کبھی پھر زندہ کر کے

انسانی جان اور جسم کے خلاف جرائم کی سزا

اسلامی قانون میں

(۲)

ڈاکٹر عبدالعزیز عامر

ترجمہ - معروف شاہ شیرازی

۲- قتل بالسببیت | کسی کے قتل کا سبب بننے کی ایک صورت یہ ہے کہ مثلاً گواہ کسی کے خلاف گواہی دیں کہ اس نے قتل کا ارتکاب کیا ہے اور ان کی شہادت کی بنا پر اُسے سزا ہو جاتے اور نفاذِ حکم کے بعد وہ اپنی شہادت سے رجوع کر لیں اور اقرار کریں کہ وہ اس شخص کو سزائے موت دلوانا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے جان بوجھ کر اس کے خلاف جھوٹی گواہی دی۔ یا مثلاً جج کو یہ معلوم ہو کہ ملزم بے گناہ ہے لیکن وہ اُسے قصداً سزا دے اور بعد میں اعتراف کرے کہ اس نے جان بوجھ کر اُسے سزا دی۔

(بقیہ تفہیم القرآن)

اٹھائے جائیں گے۔ یہ معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرات حسن بصری، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے بیان کیے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ آخرت کی رحمت و مغفرت سے اُسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر ہر خیر سے مایوس ہیں، کیونکہ انہیں اپنے مبتلائے عذاب ہونے کا یقین ہو چکا ہے۔ یہ معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور حضرات مجاہد، عکرمہ، ابن زید، کلبی، مقاتل اور منصور رحمہم اللہ سے منقول ہیں۔

اس کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک فریق کی رائے ہے کہ قاتل بالسببیت مثلاً گواہ، جج یا اس جیسے دوسرے لوگ جو اسی طرح قتل کے سبب بنیں، ان پر قصاص واجب نہیں ہے، کیونکہ یہ لوگ اگرچہ قتل کے اسباب فراہم کرتے ہیں لیکن یہ اسباب کسی شخص کو مجبور نہیں کر دیتے کہ وہ قتل کا شکار ہو۔ مثلاً ایک شخص دوسرے کے لیے کنواں کھودتا ہے تو وہ اُسے مجبور نہیں کر دیتا کہ وہ شخص لازماً اس میں گرے۔ پھر ان صورتوں میں نفاذِ قصاص میں مماثلت بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ قصاص میں تو سبب بننے والے کا قتل براہِ راست ہوگا حالانکہ جس قتل کا اُس نے ارتکاب کیا ہے وہ براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ تھا۔ علماء کا یہ گروہ بالارادہ براہِ راست قتل اور بالارادہ بالسببیت قتل کے درمیان فرق کرتا ہے اگرچہ اس کے نزدیک دونوں حالتوں میں قتل بالارادہ ہی ہے۔ اس لیے پہلی صورت میں وہ قصاص کو واجب قرار دیتا ہے اور دوسری صورت میں واجب قرار نہیں دیتا۔

ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ قاتل بالسببیت پر قصاص واجب ہے۔ یہ رائے امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ صورتوں میں گواہوں نے یا جج نے ایسے اسباب فراہم کر دیتے تھے جن کے نتیجے میں قتل واقع ہو جاتا ہے اور ہو بھی گیا۔ لہٰذا ان پر قصاص اسی طرح واجب ہوگا جس طرح قتل کرنے والے کے ساتھ قتل پر مجبور کرنے والے پر بھی قصاص واجب ہوتا ہے۔ یہ لوگ یہ نظیر بھی پیش کرتے ہیں کہ قاسم بن عبدالرحمٰن کی روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے دو گواہوں نے ایک شخص کے خلاف چوری کی شہادت دی اور آپ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس کے بعد گواہوں نے اپنی شہادت سے رجوع کر لیا۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ تم دونوں نے جان بوجھ کر جھوٹی گواہی دی ہے تو میں تمہارے ہاتھ کاٹ دیتا۔ لیکن چونکہ عمداً جھوٹی گواہی دینے کا کوئی ثبوت نہ تھا اس لیے آپ نے حکم دیا کہ وہ ہاتھ کی دیت ادا کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ کے نزدیک جو شخص قصداً کسی کا ہاتھ کٹوانے کے لیے جھوٹی گواہی دے اس نے گویا اس فعل کا ارادہ کیا جس کا نتیجہ ہاتھ کٹنا تھا، اور وہ نتیجہ رونما بھی ہو گیا، اس لیے اس پر قصاص واجب ہے کیونکہ وہ قصداً ایک انسان کا ہاتھ کٹنے کا سبب بنا ہے۔ علاوہ بریں جن جرائم میں قصاص واجب ہوتا ہے وہ اکثر بالسببیت واقع ہوتے ہیں۔ اب اگر ہم سزا کو صرف اسی مجرم تک محدود کر دیں جس نے براہِ راست جرم کا ارتکاب کیا۔ اور بالسببیت جرم

کرنے والے سے قصاص نہ لیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجرمین براہِ راست قتل کے بجائے بالسببیت قتل کا راستہ اختیار کریں گے اور قانون قصاص معطل ہو جائے گا[1]۔

خلاصہ یہ کہ امام ابوحنیفہؒ بالارادہ قتل بالسببیت میں قصاص کو واجب نہیں سمجھتے، اور فقہاء کی اکثریت اس نوعیت کے قتل کو موجب قصاص سمجھتی ہے۔ میں اسی دوسری رائے سے اتفاق رکھتا ہوں کیونکہ بالسببیت قتل کا موجب بننے والا وہ کام کرتا ہے جس کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے نتیجہ میں اغلباً قتل واقع ہو جایا کرتا ہے، اس لیے وہ اس آلہ کے مشابہ ہے جس کے استعمال سے عادۃً قتل رونما ہوتا ہے، اور ایسے آلے سے جب قتل واقع ہو تو فقہاء کی اکثریت اسے موجبِ قصاص مانتی ہے۔

۳- جبکہ مقتول قاتل کا جزء ہو: اگر مقتول قاتل کا جزو ہو، یعنی وہ قاتل کی اولاد میں سے ہو، مثلاً قاتل باپ ہو یا باپ کے حکم میں ہو اور وہ بیٹے کو قتل کر دے۔ یا قاتل ماں ہو یا ماں کے حکم میں ہو اور وہ اپنے بچے کو قتل کر دے تو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام ثوریؒ کے نزدیک ایسے قاتل سے قصاص نہ لیا جائے گا۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے لا یقاد الوالد بولدہٖ "والد سے بیٹے کا قصاص نہ لیا جائے گا" اور عادۃً ایسا نہیں ہوتا کہ ماں یا باپ اپنی اولاد کو قتل کر دیں، کیونکہ فطری طور پر ان کے اندر اولاد کے لیے شفقت ہوتی ہے۔ اس لیے اس معاملہ میں شبہ کا موقع پیدا ہو جاتا ہے اور شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جاتا ہے۔ مزید برآں باپ چونکہ بیٹے کی زندگی کا سبب ہوتا ہے لہٰذا وہ بیٹے کی وجہ سے قتل نہ ہوگا۔ یہی حکم ماں، دادا، دادی، نانا اور نانی کا بھی ہے کہ وہ باپ کے درجہ میں ہیں اور بیٹے یا پوتے یا نواسے کا قصاص ان سے نہیں لیا جا سکتا[2]۔ اور ایسی حالت میں

---

[1] بدائع الصنائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۹۔ اسنی المطالب، ابویحییٰ زکریا الانصاری الشافعی، ج ۴ ص ۵ اور اس کے بعد، طبع ۱۳۱۳ھ مطبع میمنیہ، مصر۔ مواہب الجلیل، ج ۶ ص ۲۴۱، طبع اول ۱۳۲۹ھ، مطبع السعادۃ مصر۔ المغنی، ابن قدامہ، ج ۹، ص ۳۳۲ اور اس کے بعد۔ التشریع الجنائی الاسلامی عبدالقادر عودہ ص ۴۵۵-۴۵۶۔

[2] الکاسانی ج ۷، ص ۲۳۵۔ تبیین الحقائق شرح الکنز، امام زیلعی جلد ۶ ص ۱۰۵۔ الاحکام السلطانیۃ الماوردی ص ۲۲۰۔

بھی قاتل سے قصاص نہیں لیا جا سکتا جبکہ مقتول کے وارثوں میں سے کوئی قاتل کے فروع میں سے ہے، کیونکہ قاتل کے اس فرع کی طرف سے قصاص واجب نہیں ہوتا، اور قصاص ایسی سزا ہے جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے مقتول کے تمام وارثوں کے حق میں صرف دیت واجب ہو گی۔[1]

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ باپ یا دادا اگر بیٹے یا پوتے کو تلوار اور لاٹھی سے قتل کر دیں تو اس صورت میں قصاص نہیں ہو گا لیکن اگر وہ اُسے لٹا کر ذبح کر دیں تو قصاص ہو گا۔[2]

وہ مقتول جو مطلقاً معصوم الدم نہ ہو | اگر شخص متضرر معصوم الدم نہ ہو تو اس کے قاتل سے بھی قصاص نہ لیا جائے گا۔ مثلاً کسی ملک کا مسلم باشندہ یا غیر مسلم ذمی کسی حربی کافر یا مرتد کو قتل کر دے، یا کوئی وفادار شہری کسی باغی کو قتل کر دے۔[3] ایسے مقتول چونکہ معصوم الدم نہیں ہیں، اس لیے ان کے قتل ہو جانے پر قصاص واجب نہ ہو گا نیز

[1] الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۵۔

[2] بدایۃ المجتہد، ابن رشد، طبع اوّل ۱۳۲۹ھ، ج ۲ ص ۳۶-۳۳۵- ابن رشد کہتے ہیں: امام مالکؒ اور جمہور کے درمیان اختلاف رائے کا سبب وہ حدیث ہے جو حضرت عمرو بن شعیب سے مروی ہے کہ بنی مدلج کے ایک شخص قتادہ نے اپنے بیٹے کے تلوار گھونپ دی جس سے اس کی پنڈلی زخمی ہوئی اور زخم سے اس قدر خون بہا کہ وہ مر گیا۔ اس پر سراقہ ابن جعشم حضرت عمر بن خطاب کے پاس آئے اور ان کے سامنے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ نے مقتول کے بھائی کے حق میں سو اونٹ دیت کا حکم دیا جس میں سے تیس سہ سالہ، تیس چہار سالہ اور چالیس پنج سالہ ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان دہرایا کہ "دیت میں سے قاتل کسی چیز کا حقدار نہیں ہے"۔

امام مالکؒ کی رائے میں یہ قتل خالص قتلِ عمد نہ تھا بلکہ ان کے نزدیک اس امر میں شبہ تھا کہ آیا باپ نے عمداً قتل ہی کی نیت سے بیٹے کو تلوار ماری تھی یا اس کی یہ نیت نہ تھی لیکن جمہور فقہاء اسے عمد ہی قرار دیتے ہیں، کیونکہ ان کا اجماع ہے کہ اگر کوئی کسی کو تلوار مارے اور وہ شخص مر جائے تو یہ قتلِ عمد ہو گا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایسے حالات میں جو قتل ہو گا، جبکہ وہ دھوکے سے بھی ہو، تو قاتل پر قتل بالارادہ کا حکم گمان غالب کی بنا پر اور اس مفروضے پر لگایا جاتا ہے کہ ایک غیر آدمی کو مقتول سے کوئی محبت نہیں ہو سکتی، اور نیتوں کا حال صرف اللہ ہی کو معلوم ہوتا ہے مگر جب اس قتل کا مرتکب مقتول کا اپنا باپ ہو تو چونکہ وہ بیٹے سے قدرتی محبت رکھتا ہے اور اسے حقِ تادیب بھی حاصل ہوتا ہے اس لیے اُسے ایک اجنبی کی طرح متہم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے امام مالکؒ اس قتل کو قتلِ عمد قرار نہیں دیتے۔ اسی کتاب میں مسلکِ ظاہری کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کے اصول کا تقاضا ہے کہ باپ سے بیٹے کا قصاص لیا جائے۔

[3] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۶۔

اگر ایک باغی شخص ایک وفادار شہری کو قتل کر دے تو بھی باغی سے قصاص نہ لیا جائے گا کیونکہ باغی کے خیال میں یہ شہری معصوم الدم نہیں ہے۔ اگرچہ اس باغی کی رائے فاسد دلائل پر مبنی ہے لیکن باغی اگر پُر شوکت (POWERFULL) ہو (یعنی مضبوط جتھا رکھتا ہو)، تو وجوب ضمان کے معاملے میں اس کی اس باطل تاویل کو بھی صحیح تاویل کے درجے میں سمجھا جائے گا۔[1]

امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اگر مستامن حربی (یعنی دشمن کے علاقے سے دارالاسلام میں امان لے کر آنے والے شخص)، کو قتل کر دے تو اس سے بھی قصاص نہ لیا جائے گا۔ کیونکہ اگرچہ مستامن معصوم الدم ہے لیکن اس کا معصوم ہونا ایک محدود وقت کے لیے ہے، ہمیشہ کے لیے اس کا خون محفوظ نہیں ہے، اس لیے اس کا خون دارالاسلام کے باشندے کے خون کے برابر نہیں ہے کہ ایک کا بدلہ دوسرے سے مساوی طور پر لیا جائے۔ نیز یہ شخص چونکہ دوبارہ دارالحرب کی طرف لوٹنے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے ہو سکتا تھا کہ اس کا کفر اُسے مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرتا۔ لہٰذا ایک حربی مستامن کے خون کی عصمت میں عدمِ عصمت کا شبہ واقع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے قاتل سے قصاص ساقط ہو جائے گا۔

لیکن امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ کیونکہ جرم کے ارتکاب کے وقت شخص متضرر کا خون معصوم تھا، وہ امان لے کر دارالاسلام میں داخل ہوا تھا اور امان کا اقتضاء یہ ہے کہ اس کا خون معصوم ہو۔[2] میرے خیال میں امام ابو یوسفؒ کی رائے زیادہ قابلِ ترجیح اور لائق قبول ہے۔

امام محمدؒ سے یہ قول مروی ہے کہ اگر ایک مستامن دوسرے کو قتل کر دے تو اس صورت میں بھی قاتل سے قصاص نہ لیا جائے گا۔[3]

خون میں عدمِ مساوات | قصاص کے نفاذ کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مقتول اور قاتل دونوں کا خون برابر ہو۔

---

[1] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۶۔

[2] السرخسی، ج ۲۶، مطبع السعادۃ قاہرہ، ص ۱۳۱ اور اس کے بعد۔ الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۶۔ شرح فتح القدیر، ج ۸، ص ۲۵۰ اور اس کے بعد، طبع اول ۱۳۱۶ھ، مطبع امیریہ بولاق مصر۔ شرح الکنز، زیلعی، ج ۶، ص ۱۰۲ اور ۱۰۵۔

[3] الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۶۔

یعنی دونوں کی جان کی نسبت ہمارے قانون کے نقطۂ نظر سے مساوی ہو۔ فقہاء نے قاتل اور مقتول کے خون میں عدم مساوات کے چار اسباب بیان کیے ہیں:

۱۔ اسلام اور کفر

۲۔ آزادی اور غلامی

۳۔ صنف کا اختلاف (یعنی مرد و عورت کا اختلاف)

۴۔ وحدت اور کثرت کا اختلاف

جب قاتل اور مقتول ان چاروں چیزوں میں مساوات رکھتے ہوں تو بالاتفاق قصاص واجب ہو جاتا ہے لیکن اگر دونوں کے درمیان ان میں سے کوئی اختلاف موجود ہو تو قصاص کے وجوب میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمّی کو قتل کر دے تو بعض فقہاء کی رائے میں مسلم کو بطور قصاص قتل نہ کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ، امام ثوریؒ، امام احمدؒ اور داؤد ظاہری اسی رائے کے قائل ہیں۔ لیکن بعض دوسرے فقہاء کی یہ رائے ہے کہ مسلمان کو ذمّی کے بدلے بطور قصاص قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ابن ابی لیلیٰ اسی طرف گئے ہیں۔ امام مالکؒ اور لیث بن سعد کہتے ہیں کہ مومن کو ذمّی کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا الّا یہ کہ مسلمان نے ذمّی کو بے دردی سے قتل کر دیا ہو۔ ان کے نزدیک بے دردی کا مفہوم یہ ہے کہ اُسے لٹا کر ذبح کیا گیا ہو، خصوصاً جبکہ اس فعل کا محرک مقتول کا مال لینا ہو۔

جو لوگ قصاص کے قائل نہیں ہیں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ "مومن کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے"۔ یہ حدیث عمرو بن شعیب نے بھی اپنے باپ اور دادا کے واسطے نقل کی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ہم خیال اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قبلہ میں سے ایک شخص کو ایک ذمّی کے بدلے قتل کیا اور فرمایا کہ یہ بات سب سے بڑھ کر میرے لائق ہے کہ میں عہد کا پابند رہوں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ جس حدیث میں ارشاد ہوا ہے

کہ "کوئی مسلم کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے"۔ اس میں اگرچہ کافر کا لفظ عام ہے مگر یہ حدیث اسے کافر حربی کے معنی میں مخصوص کر دیتی ہے اور ذمّی اس کے حکم سے خارج ہو جاتا ہے۔ نیز وہ اس سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر کوئی مسلم ذمّی کا مال چرائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ لہٰذا قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ جب ذمّی کا مال مالِ مسلم کے برابر ہے تو اس کی جان بھی ایک مسلم کی جان کے برابر ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھیوں کا مسلک ہی درست ہے۔ اگر ذمّی کے خون کی حرمت ہی نہ ہو تو پھر عقدِ ذمّہ کے معنی آخر کیا رہ جاتے ہیں؟ نیز اہلِ ذمّہ دارالاسلام کے شہری ہیں۔ ان کے حقوق وہی ہیں جو ہمارے ہیں ——— اور ان کی ذمّہ داریاں وہی ہیں جو ہماری ہیں۔

۲۔ اگر مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو بعض فقہاء نے یہ کہا ہے کہ وہ عورت کے بدلے قتل نہ ہو گا۔ لیکن یہ رائے بھی جمہور فقہاء کی آراء کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد اسی طرح قتل کیا جائے گا جس طرح ایک عورت کسی مرد کو قتل کرنے کے جرم میں قتل کی جائے گی بحیثیت انسان دونوں مساوی ہیں اور دونوں کی جان یکساں محترم ہے۔

۳۔ اگر کچھ لوگ مل کر ایک شخص کو قتل کر دیں تو داؤد اور اہلِ ظاہر کہتے ہیں کہ ایک شخص کے بدلے کئی شخصوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قرآن مجید کا حکم ہے اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، یعنی "جان کے بدلے جان"۔ لیکن جمہور فقہاء نے اس رائے کو بھی رد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مقتول کے بدلے قاتلوں کی پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا۔ یہی رائے حضرت عمرؓ کی تھی۔ صنعاء کے ایک مقتول کے مقدمے میں انہوں نے فرمایا کہ اگر اہلِ صنعاء سب کے سب اُس پر حملہ آور ہوئے ہوتے اور اُسے قتل کر دیتے تو میں سب کو اس ایک کے بدلے قتل کر دیتا۔ نیز مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک مقتول کے بدلے متعدد قاتلین کو قتل کیا جائے۔ شریعت نے قصاص کا حکم جس مقصد کے پیشِ نظر دیا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ ارتکابِ قتل سے باز رہیں۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ "اے عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے"۔ اگر ایک مقتول کے متعدد قاتلین پر سے قصاص ساقط کر دیا گیا تو مجرمین اجتماعی شکل میں قتل کا ارتکاب کر کے قصاص سے بچ نکلیں گے اور وہ مقصد بھی فوت ہو جائے گا جس کے لیے شارع نے قانون بنایا تھا۔[1]

[1] قاتل و مقتول کے خون کے درمیان مساوات، اس کی شرائط، ہر شرط کے لیے بیان کردہ تفصیلی دلائل اور فقہاء کی آراء کے لیے

میرے نزدیک جمہور کی رائے ہی قابلِ قبول ہے۔ کیونکہ جب مجرم متعدد ہوں تو ہر ایک کے دل میں قتل کا ارادہ پایا جاتا ہے، اور متضرر کی موت سب کے فعل کی وجہ سے واقع ہوتی ہے، اور شرائط قصاص ہر ایک کے بارے میں پوری ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا کسی کو محض اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ جرم میں کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ شریک تھے۔ بلکہ متعدد افراد کا جرم میں شریک ہونا ارتکابِ جرم کے لیے اور ممد و معاون ہو جاتا ہے اور ایسی صورتوں میں بالعموم جرم کا ارتکاب زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی سزا ایسی عبرتناک ہونی چاہیے جو لوگوں کو اس فعل کے ارتکاب سے باز رکھنے والی ہو۔

خون کی معافی | قصاص کا مطالبہ مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ اور خون کی معافی کا حق بھی انہی کو پہنچتا ہے خواہ وہ دیت لے کر معاف کریں یا بلا معاوضہ معاف کر دیں۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر اولیائے مقتول قصاص معاف کر دیں تو وہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فمن عُفِیَ لہ من اخیہ شیءٌ فاتباعٌ بالمعروف واداءٌ الیہ باحسان "پھر اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو تو معروف طریقے کے مطابق خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو چاہیے کہ راستی کے ساتھ خون بہا ادا کرے"۔ (۲: ۱۷۸) اور حدیث میں آتا ہے کہ العمد قود الا ان یعفو ولی المقتول "قتل عمد میں قصاص ہے الّا یہ کہ مقتول کا ولی معاف کر دے"۔ اس لیے اگر مقتول کے ورثاء خون معاف کر دیں تو قاضی قصاص کا حکم نہیں دے سکتا، کیونکہ معافی سے قصاص لازماً ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر قصاص ساقط ہو جائے خواہ اس کے بدلے دیت لی جائے یا دیت بھی معاف کر دی جائے تو سوال یہ ہے کہ اس صورت میں قاتل کو بغیر کسی سزا کے چھوڑ دیا جائے گا، یا اُسے کوئی سزا دی جائے گی؟ اس مسئلے پر ہم ان شاء اللہ عنقریب بحث کریں گے۔

۴۔ ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، ابن رشد، ج ۲ ص ۳۲۳ - ۳۲۵ - الاحکام السلطانیہ الماوردی، ص ۲۱۹ - ۲۲۰

ترکی میں نئی دینی بیداری

يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ

خلیل حامدی

(اشاعتِ گذشتہ میں ہم نے انگلستان کے اخبار گارڈین کا ایک مقالہ نقل کیا تھا جس میں اس کے یہودی نامہ نگار نے دینی بیداری کی اُس لہر پر خطرے کی گھنٹی بجائی تھی جو آج کل ترکی میں کارفرما ہے۔ اب ہم دو مضمون اور نقل کرتے ہیں جن میں سے ایک یہ بتاتا ہے کہ ترکی میں اِس وقت دین کے لیے کیا کام ہو رہا ہے، اور دوسرا یہ منظر دکھاتا ہے کہ کفّار کے گھر میں اس پر کیسا ماتم برپا ہے۔ خ ح)

پچھلے ماہ مئی میں ترکی کے ایک دینی وفد نے حکومتِ عراق کی دعوت پر عراق کا دورہ کیا تھا۔ واپسی پر یہ وفد ۲۴ مئی ۱۹۶۸ء کو تھوڑی دیر کے لیے بیروت ٹھیرا۔ وہاں مشہور اسلامی ہفت روزہ الشہاب کے ایڈیٹر نے اس سے ملاقات کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ترکی میں آج کل احیائے اسلام کے لیے کیا کام ہو رہا ہے۔ وفد کے سربراہ محمد بشار تو داغو تھے جو ترکی کے محکمہ امورِ مذہبی میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں، اور ارکان میں آستنہ کے مفتی شیخ جمال الدین قبلای بھی شامل تھے۔ اس ملاقات کی روداد یکم جون ۱۹۶۸ء کے الشہاب میں شائع ہوئی ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

سوال: آپ کے دورۂ عراق کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: ہمارا یہ دورہ عراق کی وزارتِ اوقاف کی دعوت پر تھا۔ اس دَورے میں ہم نے بغداد کے علاوہ موصل، نجف، کربلا، اربیل اور بصرہ کا سفر بھی کیا۔ عراق کے مسلمانوں نے ہماری انتہائی آؤبھگت کی عراق کے سرکاری افراد سے بھی ہماری ملاقاتیں ہوئیں۔ علمائے عراق سے ہماری طویل گفتگوئیں ہوئیں، علماء کی طرف سے

ہمارے اعزاز میں ۲۵ تقریبیں منعقد کی گئیں۔

سوال: کیا آپ مختصراً یہ بتا سکتے ہیں کہ ترکی کا محکمۂ امورِ مذہبی اسلامی دعوت و تبلیغ کے بارے میں کیا کوششیں سرانجام دے رہا ہے؟

جواب: آج سے ۵۰ سال قبل (عدنان میندریس کے عہدِ حکومت میں) ایک سرکاری فرمان جاری ہوا تھا جس کی رُو سے محکمۂ امورِ مذہبی کی تشکیل عمل میں آئی۔ آج یہ محکمہ ترکی کے مختلف حصوں میں پائی جانے والی ۶۳ ہزار مسجدوں کی نگرانی کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ان میں سے ۳۵ ہزار وہ مسجدیں ہیں جو دیہی آبادیوں میں پائی جاتی ہیں اور ۲۸ ہزار بڑے بڑے شہروں اور ضلعی مقامات میں پائی جاتی ہیں۔ اس وقت محکمۂ امورِ مذہبی کی طرف سے جن اماموں اور خطیبوں کو ماہانہ معاوضہ اور دوسری ضروریات فراہم کی جا رہی ہیں اُن کی تعداد ضلعی مقامات میں ۲۳ ہزار اور دیہی آبادیوں میں ۴۰ ہزار ہے۔ یہ تمام امام اور خطیب مخصوص درسگاہوں کے فارغ شدہ ہیں، جو مدارس ائمہ و خطباء کے نام سے معروف ہیں۔ کسی ایسے شخص کو جو ان درسگاہوں کا فارغ نہ ہو امام یا خطیب نہیں بنایا جا سکتا۔ ان درسگاہوں سے ہر سال ۲ ہزار امام اور خطیب سندِ فراغت حاصل کرتے ہیں۔ اس پوری تعداد کو محکمۂ امورِ مذہبی اپنی ملازمت میں لے لیتا ہے اور شہروں اور دیہات میں ان سے مختلف خدمات لیتا ہے۔ مسجد کے مؤذن کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ حفظِ قرآن کے مدرسے کا فارغ ہو۔ ہماری طرف سے کسی ایسے شخص کو مؤذن نہیں مقرر کیا جاتا جب تک اُس نے مکمل قرآن کریم حفظ نہ کر لیا ہو۔ ان مؤذنوں کی تیاری کے لیے بھی الگ مدارس قائم ہیں۔

سوال: ان اماموں اور خطیبوں اور مؤذنوں کی تعلیم کا نظام کیا ہے اور جن مدارس میں یہ تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کا معیار کیا ہے؟

جواب۔ اِس وقت ترکی میں اماموں اور خطیبوں کے مخصوص مدرسوں کی کل تعداد ۵۰ ہے۔ یہ مدرسے ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہیں، اور انٹرمیڈیٹ کے معیار کے برابر ہیں۔ ان میں ان دنوں ۳۰ ہزار طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ ان مدارس کے فارغ شدہ کی تنخواہ کا گریڈ بھی وہی ہے جو انٹرمیڈیٹ کے فارغ شدہ کا ہوتا ہے۔ حکومت کے مروجہ نظام کے تحت یہ بھی ہر تین سال کے بعد ترقی اور الاؤنس کے اُنہی حقوق سے متمتع ہوتے ہیں جو دوسرے سرکاری ملازمین کے لیے مخصوص ہیں۔ سالِ رواں میں ایک نیا قانون جاری ہوا ہے جس کی رُو سے ان مدارس کا فارغ شدہ

یونیورسٹیوں کے تمام کالجوں میں داخلہ لے سکتا ہے خواہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے کالج ہوں یا آرٹس کالج ۔ مثلاً میڈیکل، انجینئرنگ، قانون اور آرٹس کے کالجوں میں سے جس کالج میں چاہے بلا روک داخل ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ملک میں اعلیٰ تعلیم کے چار ادارے موجود ہیں جو ترکی کی یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ ائمہ اور خطباء کے مدارس کے طالب علم فراغت کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ان اداروں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ان کا کورس چار سالہ ہے اور ان میں عربی زبان اور عربی نحو و بلاغت کے ساتھ ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے ۔ ان کے فارغ شدگان کو ضلع کے مفتی اور مبلّغ کا منصب سونپا جاتا ہے ۔ اس وقت ہر ضلع کے اندر جو مبلّغ اور دینی رہنما کام کر رہے ہیں اُن کی تعداد فی ضلع ۲۰ اور ۳۰ کے درمیان ہے ۔ یہ سب مذکورہ بالا اداروں کے سند یافتہ ہیں اور محکمہ امورِ مذہبی ان کو معقول معاوضے دیتا ہے ۔

مؤذنوں کے لیے اس وقت ترکی میں ۴۴۴۴ حفظ قرآن کے مدرسے ہیں جن میں ایک لاکھ ۳۶ ہزار طلبہ قرآن حفظ کر رہے ہیں۔ ان مدارس میں سے ایک ہزار مدرسے وہ ہیں جو براہِ راست محکمہ امورِ مذہبی کی نگرانی میں ہیں اور باقی عوام کے رفاہی اداروں کے تحت چل رہے ہیں۔ آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ اس وقت ترکی میں ایک ہزار ۳۸ رفاہی انجمنیں ہیں جو مساجد کی تعمیر اور حفظِ قرآن کے مدرسوں کی نگرانی اور انتظام کے لیے وقف ہیں ۔

محکمہ امورِ مذہبی کا سالِ رواں کا بجٹ ایک ارب ۸ کروڑ ۴۰ ترکی لیرا ہے۔ پبلک اوقاف کا بجٹ اس کے علاوہ ہے جس کی مقدار ۶ کروڑ ۳۰ لاکھ ترکی لیرے ہے۔ محکمہ امورِ مذہبی میں مدغم شدہ اوقاف کا بجٹ اس سے الگ ہے ۔ نیز ایک ہزار ۳۸ رفاہی اداروں کا بجٹ بھی اپنی جگہ الگ طور پر بہت بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہم نے ایک نیا سہ سالہ منصوبہ بنایا ہے ۔ اس منصوبے کے تحت ہم اماموں اور خطیبوں کے مدارس کی تعداد ۱۲۰ کر دیں گے (موجودہ تعداد ۵۸ ہے) ۔ ترک عوام رفاہی اداروں کی وساطت سے جو دینی مدارس قائم کرتے ہیں ان کا بھی یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ محکمہ امورِ مذہبی ان کو اپنی تحویل اور نگرانی میں چلائے ۔

سوال: آپ کے ان پروگراموں کے اندر ترکی کی مسلمان عورت کہاں تک حصہ لیتی ہے ؟

جواب ۔ اماموں اور خطیبوں کے جتنے مدرسے اس وقت ہماری نگرانی میں ہیں اُن میں سے عورتوں کا

کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک عورت کا یہ میدان نہیں ہے ۔ البتہ ہم نے ان مدرسوں میں لڑکیوں کے لیے بھی داخلہ کھول دیا ہے تاکہ یہاں سے جو لڑکیاں فارغ ہوں وہ گرلز اسکولوں میں دینیات کی تدریس کا کام سرانجام دیں۔ آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ ترکی کے پرائمری، مڈل اور ثانوی اسکولوں میں دینی تعلیم کا بھرپور انتظام ہے حفظ قرآن کے مدرسوں میں بھی اب لڑکیاں داخل ہو رہی ہیں۔ آپ کو لاتعداد کمسن بچیاں ملیں گی جو پورا قرآن حفظ کر چکی ہیں۔

سوال : اسلامی نظریہ کے فروغ میں محکمۂ امور مذہبی کیا علمی اور تبلیغی سرگرمیاں انجام دے رہا ہے ؟

جواب : محکمۂ امورِ مذہبی کا شعبۂ نشر و اشاعت پرانی اور نئی اسلامی کتابوں کے ترکی زبان میں ترجمے کرواتا ہے۔ بعض اسلامی کتابوں کو از سرِ نو چھاپ رہا ہے۔ اس شعبے کی طرف سے جو کتابیں شائع کی جاتی ہیں وہ نہایت ارزاں قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ شعبۂ نشر و اشاعت حدیث اور تفسیر کے قدیم ذخیرے کو ہی زندہ کرنے پر اکتفا نہیں کر رہا ہے بلکہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (پاکستان)، اور سید قطب اور محمد قطب اور دوسرے اسلامی رہنماؤں کی اکثر و بیشتر کتابیں ترکی میں ترجمہ کرکے چھاپ رہا ہے۔ اب تک ایسی ۶۰ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ بعض کتابوں کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ مثلاً سید قطب کی کتاب العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام (اسلام کا عدلِ اجتماعی) کے اب تک تین ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر ایڈیشن دس ہزار کی تعداد میں چھپا ہے۔ اسی طرح محمد قطب کی مشہور کتاب جاہلیۃ القرن العشرین (بیسویں صدی کی جاہلیت) بھی دو مرتبہ چھپ چکی ہے۔ ان نامور اسلامی رہنماؤں سے ترک عوام بھی اسی طرح واقف ہو چکے ہیں جس طرح خود ان کے اپنے ملک کے باشندے۔

یہ تھا ایک رُخ ۔ اب دوسرا رُخ ملاحظہ ہو:

برطانیہ کے یہودی جریدہ "جیوش کرانیکل" نے ۱۹ اپریل ۶۸ء کی اشاعت میں اپنے انقرہ کے نامہ نگار خصوصی کی حسبِ ذیل رپورٹ شائع کی ہے :

"خدامِ مذہب کی یونین" نے، جو ترکی کی ایک قدامت پرست تنظیم ہے، تاجروں سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ تمام یہودی کمپنیوں اور ترکی کی دوسری غیر یہودی اقلیت کے تجارتی اداروں کا مقاطعہ کریں۔ یہ اپیل ایک

ایسے عام اجتماع میں کی گئی ہے جس میں ترکی کے مختلف حصوں سے مذہبی معلمین اور علماء کی بہت بڑی تعداد شامل ہوئی تھی۔ شرکائے اجتماع نے یک زبان ہو کر یہ مطالبہ کیا کہ وطنی اقتصادیات پر جتنی غیر مسلم اقلیتیں چھائی ہوئی ہیں اُن کا مکمل اور دوامی مقاطعہ کیا جائے۔

انقرہ میں بھی ایک زبردست اجتماع منعقد ہوا ہے جسے "اینٹی کمیونزم نیشنل کنسر وٹو آرگنائزیشنز" کے اجتماع کا نام دیا گیا ہے۔ مگر یہ اجتماع بھی "اینٹی کمیونزم" کے بجائے "اینٹی یہود" اجتماع میں تبدیل ہو گیا۔ شرکائے اجتماع نے ایسے پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے جن پر یہودیوں کے خلاف طرح طرح کے فقرے لکھے ہوئے تھے۔ مثلاً ایک فقرہ یہ تھا: "یہودی استعمار مردہ باد"۔ اس اجتماع کے کچھ عرصہ بعد طیبا ایجو نامی شخص کی ایک تالیف منظر عام پر آئی ہے جو "سامیت دشمن" (یعنی مخالف یہودیت) افکار پر مشتمل ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو فتنہ اور شر بھی کہیں پایا جاتا ہے اس کے پیچھے یہودیوں کا مفسد دماغ ہی کام کر رہا ہے۔

ترکی روزنامہ "بگین" نے بھی یہودیوں کے خلاف اپنی مذموم مہم جاری کر رکھی ہے۔ اس اخبار کا ہر شمارہ ایسے مضامین و مقالات سے بھر پور ہوتا ہے جن میں یہودیوں کے خلاف زہر اگلا جاتا ہے اور یہودیوں کی تجارتی کمپنیوں کی فہرستیں چھاپی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس اخبار کی روزانہ اشاعت ۰ ۷ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ ابھی چند ہفتے قبل کی بات ہے کہ اس کی اشاعت یومیہ ۱۵ ہزار تھی۔ یہودی لیڈروں کی طرف سے ان حملات کے خلاف بارہا احتجاج کیا گیا ہے مگر ترکی حکومت نے ابھی تک یہود دشمن سرگرمیوں کو روکنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کی، حالانکہ یہودی عناصر ان سرگرمیوں کے بُرے اثرات کو محسوس کر رہے ہیں۔ مختلف رپورٹوں سے معلوم ہوا ہے کہ بعض یہودی تاجروں کو اپنے گاہکوں کی طرف سے ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں انہیں اطلاع دی گئی ہے کہ "اب وہ ان کے ساتھ کاروباری معاملات جاری نہیں رکھیں گے"۔

ایک اور مضمون ۲۶ اپریل ۱۹۶۸ء کے جیوش کرانیکل میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ترکی میں مخفی پروپگنڈے کا پھر آغاز ہو گیا"۔ یہ بھی اس کے نمائندہ انقرہ کا لکھا ہوا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"یہود دشمن تحریک کی تازہ ترین مہم یہودیوں کی خون آشامی کے مذموم نظریے کی دوبارہ اشاعت اور تجدید ہے۔ یہ مہم ترکی کے اخبار "بگین" نے جاری کر رکھی ہے۔ یہ اخبار چند ماہ پیشتر جاری ہوا ہے اور انتہا پسند مذہبیت

کا علمبردار ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس وقت اس کی روزانہ اشاعت ۳۰ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ "بگن" نے ایک مضمون شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے: "اے غیر یہودیو! اپنے بچوں کی نگرانی رکھو"۔ اس اخبار نے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ یہودی غیر یہودی بچوں کی خونریزی کو ایک مذہبی خدمت سمجھتے ہیں۔ اور یہ دیو مالائی کہانی یا کوئی خود ساختہ افسانہ نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس سلسلے میں اخبار نے لکھا ہے: "آج غیر یہودیوں کو اپنے بچوں پر کڑی نگرانی رکھنی چاہیے۔ کیونکہ یہ یہودیوں کا وہ مشہور تہوار ہے جسے "عید الفصح" کہتے ہیں۔ روس کے اندر یہودیوں کے خلاف جو خونریز ہنگامے برپا ہوتے تھے اُن کا سبب بھی یہودیوں کی یہی رسم تھی۔ اس رسم کو پورا کرنے کے لیے یہودی عید الفصح کے روز "ازما" کسی غیر یہودی کمسن بچے کے خون کا نذرانہ پیش کرتے ہیں[1]"۔

اخبار "بگن" نے اپنے ایک افتتاحیہ میں اس امر کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ آجکل اُسے کمپنیوں اور فرموں کے اشتہارات نہیں مل رہے ہیں کیونکہ ترکی کی تجارت اور اقتصادیات پر جن کمپنیوں کا قبضہ ہے وہ سب یہودیوں کی ہیں اور انہوں نے اس اخبار کا مقاطعہ کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ دوسری جانب یہ اخبار بھی مسلسل یہودی فرموں کی بلیک لسٹ چھاپ رہا ہے اور مسلمانوں سے اپیل کر رہا ہے کہ اقتصادی طور پر ان فرموں کا مکمل بائیکاٹ کیا جانا چاہیے۔ ترکی کے ایک اخبار نے جس کا نام "اقسم" ہے اور جو استنبول سے نکلتا ہے اور دائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے، بگن پر بالواسطہ تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بگن" کی یہ مہم فاشزم کی روح سے لبریز ہے۔ یہ لوگ ہٹلر کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ان کی تمام تر کارروائیاں ترکی اقتصادیات کی تباہی اور ملکی ترقی کو مفلوج کرنے کے مترادف ہیں"۔

---

[1] اس رسم کی تفصیل یہ ہے کہ یہودی یہ رسم ۱۵ اپریل کو مناتے ہیں۔ یہودی روایات کے مطابق اس تاریخ کو عبرانی قوم (بنی اسرائیل) نے حضرت موسیٰ کی قیادت میں مصر سے خروج کیا تھا اس رسم کی رو سے اس تاریخ کو یہودی کسی غیر یہودی کمسن بچے کے خون سے فطیری روٹی تیار کرتے ہیں اور مدرات کو کھاتے ہیں۔ اس مذہبی رسم کو وہ EKSOTERIK کہتے ہیں۔ اشعیاہ کی کتاب میں اس کا ذکر ہے یہودی مورخین نے اس رسم کو اپنی تصنیفات میں بیان کیا ہے۔ راقم الحروف کے پاس اس بارے میں مفصل مواد موجود ہے جو مستند تاریخی کتابوں سے جمع کیا گیا ہے مجھے تو یہ شبہ ہو رہا ہے کہ پاکستان میں جو اکثر کم سن بچے گم ہو جاتے ہیں وہ شاید یہودی گاہکوں کے پاس چلے جاتے ہیں اور وہ ان سے اپنی مذہبی رسم پوری کرتے ہیں۔ ترجمان القرآن کے آئندہ کسی شمارے میں اس موضوع پر مفصل روشنی ڈالی جائے گی۔

رسائل و مسائل

صحابۂ کرام کے متعلق عقیدۂ اہلِ سنّت

سوال :- میں آپ کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کی چند باتیں اہلِ سنت والجماعت کے اجماعی عقائد کے بالکل خلاف نظر آ رہی ہیں۔ صحابۂ کرام میں سے کسی کا بھی عیب بیان کرنا اہل سنت والجماعت کے مسلک کے خلاف ہے۔ جو ایسا کرے گا وہ اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہو جائے گا۔ آپ کی عبارتیں جو اس عقیدے کے خلاف ہیں وہ ذیل میں نقل کرتا ہوں :-

" ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا " (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۵۰)

" اب خلافت علی منہاج النبوت کے بحال ہونے کی آخری صورت یہ باقی رہ گئی تھی کہ حضرت معاویہ یا تو اپنے بعد اس منصب پر کسی شخص کے تقرر کا معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چھوڑ دیتے یا اگر قطع نزاع کے لیے اپنی زندگی ہی میں جانشینی کا معاملہ طے کر جانا ضروری سمجھتے تو مسلمانوں کے اہلِ علم و اہل خیر کو جمع کر کے انہیں آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنے دیتے کہ ولی عہدی کے لیے اُمت میں موزوں تر آدمی کون ہے۔ لیکن اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لیے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لے کر انہوں نے اس امکان کا بھی خاتمہ کر دیا " (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۴۸)

" حضرت عثمانؓ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا " (خلافت و ملوکیت، صفحہ ۱۱۶)

براہ کرم آپ بتائیں کہ صحابۂ کرام کے بارے میں آپ اہلِ سنت والجماعت کے اجماعی عقیدے کو غلط سمجھتے ہیں یا صحیح ؟

جواب۔ قبل اس کے کہ مَیں آپ کے سوالات کا جواب دُوں براہِ کرم آپ مجھے یہ بتائیں کہ:

۱۔ آیا آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی صحابی غلطی نہیں کر سکتا؟

۲۔ یا آپ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صحابی سے غلطی ہو تو سکتی ہے مگر کسی صحابی سے کبھی غلطی کا صدور ہوا نہیں ہے؟

۳۔ یا آپ اس بات کے قائل ہیں کہ افرادِ صحابہ سے غلطی کا صدور ممکن بھی تھا، اور صدُور ہوا بھی، مگر اس کو بیان کرنا جائز نہیں ہے، اور نہ صحابی کی کسی غلطی کو غلطی کہنا جائز ہے؟

ان میں سے جس بات کے بھی آپ قائل ہوں اس کی تصریح فرما دیں تاکہ مجھے یہ معلوم ہو سکے کہ آپ خود بھی اہل السنت والجماعت میں سے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو وہ اہلِ سنت میں سے کسی کا عقیدہ بھی نہیں ہے۔ اور اگر دوسری بات کے قائل ہیں تو اس کا غلط ہونا ایسے ناقابلِ انکار واقعات سے ثابت ہے جو قرآن پاک اور بکثرت احادیثِ صحیحہ اور اکابر اہلِ سنت کی نقل کردہ کثیر روایات میں بیان ہوئے ہیں۔ اور اگر تیسری بات کے قائل ہیں تو وہ بھی قطعی بے بنیاد ہے۔ کیونکہ متعدد مقامات پر خود قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کی بعض غلطیوں کا ذکر فرمایا ہے، اور محدثین نے ان کے مفصل واقعات نقل کیے ہیں، اور مفسرین میں سے شاید کسی کا بھی آپ نام نہیں لے سکتے جس نے اپنی تفسیر میں اُن واقعات کو بیان نہ کیا ہو۔ رہا اہلِ سنت کا عقیدہ جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ صحابہ پر طعن کرنا اور ان کی مذمت کرنا جائز نہیں ہے، اور اس فعل کا ارتکاب خدا کے فضل سے مَیں نے کبھی اپنی کسی تحریر میں نہیں کیا ہے۔ مگر تاریخی واقعات کو کسی علمی بحث میں بیان کرنا علمائے اہلِ سنت کے نزدیک کبھی ناجائز نہیں رہا ہے، نہ علمائے اہلِ سنت نے کبھی اس سے اجتناب کیا ہے؛ اور نہ کسی عالم نے کبھی یہ کہا ہے کہ صحابی سے اگر غلطی ہو تو اسے صحیح قرار دو، یا اس کو غلطی نہ کہو۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ مَیں نے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ اکابر اہلِ سنت ہی کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اُن کا ان واقعات کو اپنی کتابوں میں نقل کرنا دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اگر انہوں نے صحیح سمجھتے ہوئے نقل کیا ہے تو آپ کی رائے کے مطابق وہ سب بھی اہلِ سنت سے خارج ہونے چاہییں۔ اور اگر غلط یا مشتبہ سمجھتے ہوئے انہیں پھیلایا اور آئندہ نسلوں تک پہنچایا ہے تو پھر آپ کو کہنا چاہیے کہ وہ کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِباً اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ کے مصداق تھے۔

قربانی کی کھال کا مصرف

سوال: "میں قربانی کی کھال کے بارے میں اسلامی احکام معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بعض علماء کرام یہ کہتے ہیں کہ قربانی کی کھال کسی محتاج یا مسکین کو دینی چاہیے یا کسی ایسی دینی انجمن یا ادارے کے سپرد کرنی چاہیے جو اسے غریب طلبہ و یتامیٰ پر خرچ کرے۔ ان علماء کے نزدیک کھال جب بک جائے تو وہ زکوٰۃ کے حکم میں داخل ہو جاتی ہے اور اُسے اُنھی شرائط کے ساتھ انھی مدات میں صرف کیا جا سکتا ہے جو زکوٰۃ کے لیے مقرر ہیں۔ ہر طرح کے فلاح و بہبود اور رفاہی کاموں میں اس رقم کو خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ جو لوگ قربانی کرنے کے بعد بلا امتیاز ہر فرد کو اٹھا کر اپنی قربانی کی کھال دے دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے اور سوچتے کہ اسے کس مصرف میں استعمال کیا جائے گا، ان کی قربانی نہیں ہوتی۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ از روئے حدیث قربانی کرنے والے پر صرف یہ پابندی ہے کہ وہ خود کھال نہ بیچ کھائے بلکہ اسے کسی خیراتی اور خدمتِ خلق کے کام میں کسی دوسرے کے سپرد کر دے۔ اس کے بعد قربانی کرنے والے کی ذمہ داری ختم ہے۔ اور دوسرا شخص بھی اگر کسی کارِ خیر میں اسے صرف کر دے تو وہ بھی بری الذمہ ہے۔ تاہم اس مسئلے کی وضاحت کر کے اگر مطمئن کر دیا جاتے تو بہتر ہے تاکہ کسی کے ذہن میں کوئی اشکال پیدا نہ ہونے پاتے۔"

جواب: (از ملک غلام علی صاحب)، جو قربانی حج کے موقع پر حاجی کرتے ہیں اور جو قربانی عید الاضحیٰ کے موقع پر دنیا بھر کے مسلمان کرتے ہیں، دونوں کی کھال اور گوشت کے احکام شریعت میں یکساں ہیں۔ قربانی کی کھال کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

استمتعوا بجلودها ولا تبیعوھا۔ ان کی کھالوں سے فائدہ اٹھاؤ اور انہیں فروخت نہ کرو۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے مجھے حکم دیا:

لا أعطی فی جزارتها شیئًا منها — مَیں قربانی کی اُجرت میں قصائی کو گوشت اور کھال میں سے کچھ نہ دوں۔

ان احکام کا مدعا جو واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ قربانی کرنے والا قربانی کی کھال یا گوشت کو بیچ کر اس کی قیمت سے خود فائدہ نہ اٹھائے اور نہ کھال اور گوشت کو قصائی کی اُجرت میں دے۔ کھال کو کھال کی شکل میں رکھ کر اور اسے دباغت دے کر قربانی کرنے والا اُسے خود اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، چاہے تو کسی دوست کو ہدیہ دے سکتا ہے، اور چاہے تو اسے صدقہ کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ اگر قربانی کرنے والا کھال کو بیچ کر اس کی قیمت سے ذاتی فائدہ نہ اُٹھائے تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ چاہے تو کھال کو بجنسہٖ اپنے استعمال میں لائے، یا کسی فقیر یا مسکین کے سپرد کر دے یا کسی غنی کو عطیہ یا بلا قیمت تحفہ کی حیثیت سے دے دے۔ تینوں صورتیں شرعاً جائز ہیں۔ اس میں ائمہ و فقہاء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

یہاں البتہ یہ مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ قربانی دینے والا اگر کھال بیچ دے تو اس کی قیمت کا مصرف کیا ہوگا؛ نیز قربانی کرنے والا اگر اپنی کھال کسی مستطیع فرد کو بطور ہدیہ دے اور وہ مستطیع اسے فروخت کرے تو وہ اسے کہاں خرچ کرے گا؟ یہ بات تو واضح ہے کہ دونوں صورتوں میں فروخت کنندہ کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ قیمت فروخت کو اپنے مصرف میں لائے بلکہ اس پر لازم ہوگا کہ وہ اس رقم کو بطور صدقہ دے دے۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس صدقے پر صدقۂ واجبہ کا اطلاق ہوگا یا صدقۂ نافلہ کا۔ اگر اسے زکوٰۃ کی طرح صدقۂ واجبہ شمار کیا جائے تو پھر اس کا مصرف وہی ہوگا جو زکوٰۃ کا ہے اور صدقۂ نافلہ قرار دیئے جانے کی صورت میں اسے ہر کار خیر میں صرف کرنا درست ہوگا اور اس سے فقراء کے علاوہ اغنیاء بھی بعض صورتوں میں مستفید ہو سکیں گے۔

متاخرین فقہائے حنفیہ کے قول کے مطابق چرم ہائے قربانی کی قیمت فروخت کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا مصرف ہے۔ مَیں نے اپنی حد تک اس مسئلہ میں بہت غور و تأمل کیا ہے کہ اس احتیاط کا ماخذ کتاب و سنت میں کیا ہو سکتا ہے اور حنفی فقہ کی کتابوں میں تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ شاید اس جزئیے کے حق میں کوئی استدلال مذکور ہو۔ مگر مجھے اب تک ایسی کوئی مضبوط دلیل نہیں مل سکی۔ قربانی اگرچہ حضرات

احناف کی اصطلاح کے مطابق واجب ہے لیکن قربانی کے گوشت اور کھال سے متعلق جو احکام شارع نے دیئے ہیں، ان کی کوئی مماثلت زکوٰۃ و عشر کے احکام سے نہیں ہے۔ گوشت اور کھال سے قربانی کرنے والا خود بھی مستفید ہو سکتا ہے لیکن زکوٰۃ کے مال سے ایسا استفادہ ناجائز ہے۔ لا تبیعوھا میں ثمنِ جلود سے عدمِ انتفاع کا جو حکم مستنبط ہوتا ہے، اس کا مقصود اس طرح پورا ہو جاتا ہے کہ قیمت کو کسی بھی نیکی یا بھلائی کے کام یا خیراتی کام میں خرچ کر دیا جائے اور بیچنے والا اس سے ذاتی فائدہ حاصل نہ کرے۔

اگر چرمِ قربانی کی قیمت کو زکوٰۃ کے مانند قرار دیا جائے تو اس قیمت کی تحصیل اور مدّاتِ زکوٰۃ میں اس کی تقسیم کو بھی اسلامی حکومت کی ذمّہ داری ٹھہرانا پڑے گا اور یہ ایک ایسی جدّت اور بدعت ہو گی جس کی تائید میں کوئی قولی یا عملی مثال سنتِ نبوی یا خلافتِ راشدہ میں نہیں مل سکے گی۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ فقہائے حنفیہ نے کھال بیچ کر اس سے استفادہ کی ممانعت کو علی الاطلاق نہیں مانا، بلکہ اس میں تخصیص کر کے بعض صورتوں میں جواز پیدا کیا ہے جو بالکل صحیح قیاس و استحسان پر مبنی ہے۔ چنانچہ مبسوط للسرخسی جلد ۱۲ میں فرمایا ہے: لا بأس بان یشتری بجلد الاضحیۃ متاعاً للبیت (کوئی مضائقہ نہیں کہ قربانی کرنے والا قربانی کی کھال سے گھر کا سامان خرید لے)۔ پھر اس کی مزید تفصیل یہ بیان کی ہے کہ سامان ایسا ہونا چاہیے جو پائدار اور باقی رہنے والا ہو، مثلاً چھانی یا کوئی تھیلا وغیرہ ہو، اور جو شے فوری طور پر استعمال میں آ کر ختم ہو جانے والی ہو، مثلاً نمک، سرکہ وغیرہ، ایسی چیز کھال کے عوض میں نہ خریدی جائے۔ کھال بیچ کر اگر نقد قیمت لی جائے تو اس کے متعلق بھی امام سرخسیؒ صرف یہ فرماتے ہیں: فتصدق بثمنہ (اس کی قیمت صدقہ میں دے دی جائے)۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ انہوں نے صدقے کو عام اور وسیع معنوں میں رکھا ہے جس کا اطلاق صدقۂ واجبہ اور صدقۂ غیر واجبہ دونوں پر ہو سکتا ہے اور جس کا مصارفِ زکوٰۃ میں صرف کیا جانا ان کے نزدیک لازم نہیں ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ اس قیمت کو اللہ کی راہ میں اور اس کے بندوں کی فلاح و بہبود میں خرچ کر دیا جائے۔

مطبوعات

اصطلاحات سیاسیات | مرتبہ: ادارۂ تالیف و ترجمہ جامعہ پنجاب، لاہور۔ شائع کردہ: مرکزی اردو بورڈ ۳۶۔جی گلبرگ، لاہور۔

پاکستان میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے جو ٹھوس کام کیے جا رہے ہیں اُن میں مختلف مضامین کی اصطلاحات کو اردو زبان میں ڈھالنے کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ جامعہ پنجاب نے اس مقصد کے لیے ادارۂ تالیف و ترجمہ قائم کر رکھا ہے جو بڑی خاموشی مگر پورے انہماک کے ساتھ اس کام کو سرانجام دے رہا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سے پیشتر اس ادارے کی طرف سے معاشیات کی اصطلاحات شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب سیاسیات کی اصطلاحات کا مجموعہ ہے جسے مرکزی اردو بورڈ نے بڑے اہتمام کے ساتھ ٹائپ پر شائع کیا ہے۔ جن حضرات نے ان اصطلاحات کے ترجمے کا کام کیا ہے اُن میں نامور ماہرین تعلیم علم سیاست اور اردو زبان و ادب کے معروف اور مستند اساتذہ شامل ہیں۔ ہر نقشِ اول کی طرح اس نقش میں بھی اصلاح کی گنجائش موجود ہے لیکن یہ نقش اپنی موجودہ صورت میں بھی اپنے اندر بہت بڑی افادیت رکھتا ہے اور اردو زبان میں تعلیم و تدریس کی راہ ہموار کرنے میں اس سے کافی مدد لی جا سکتی ہے۔ ساڑھے چار سو صفحات کی یہ بیش قیمت کتاب جو عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے، ساڑھے چار روپے میں مل سکتی ہے۔

اسلام اور ماڈرن ازم (بزبان انگریزی) | تالیف: محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ۔ شائع کردہ: جناب محمد یوسف خان سنت نگر، لاہور۔ قیمت ۹ روپے۔ صفحات: ۲۵۲۔

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر ترجمان القرآن میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو سات ابواب کے اضافے کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ مریم جمیلہ کے قلم میں اللہ تعالیٰ نے

بڑی قوت رکھی ہے اور وہ اپنے نقطۂ نظر کو بڑے زور کے ساتھ پیش کرسکتی ہیں۔ اُن کا تصورِ دین بالکل صحیح ہے اور وہ ہر اُس تحریک اور شخصیت کی مخالف ہیں جس میں تجدد پسندی کی بُو آتی ہو۔ کسی نو مسلم مغربی خاتون کا اتنے ٹھیٹھ نظریات کا حامل ہونا اور پھر انہیں پوری جرأت کے ساتھ بیان کرنا بڑی قابلِ قدر بات ہے۔ لیکن پہلے ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے جو بات کہی تھی اُسے پھر کہنے پر مجبور ہوں کہ کسی تحریک کا ارتقاء بڑا پُرپیچ ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دنیا میں جتنے بھی مصلحین پیدا ہوئے ہیں اُن کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں زمان ومکان کے اثرات کا عکس ملتا ہے۔ ان اثرات کی خصوصاً وہ اثرات جو اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتے، نشاندہی کرنا بلاشبہ دینی خدمت ہے۔ لیکن ان اثرات کے پیشِ نظر ان مصلحین کی ساری دینی خدمات کو پسِ پشت ڈال دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ کسی فرد کی فکری لغزشیں بیان کرنے کے لیے نرم لہجہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس خامی کے باوجود کتاب بڑی قابلِ قدر ہے اور ہمارے نوجوان طبقے خصوصاً خواتین کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ معیارِ طباعت نہایت اچھا ہے اور عمدہ ذوق کا مظہر ہے۔

تاریخ ایران جلد اول
از قوم ماد تا آلِ ساسان

تالیف: پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی صاحب۔ شائع کردہ: مجلس ترقی ادب۔ ۲ کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۶۵۴۔ قیمت پچیس روپے۔

ایران کے ساتھ ہمارے تہذیبی روابط بڑے قدیم ہیں۔ جب عرب سے اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو اس کی حیات آفریں کرنوں سے ایران اور پاک وہند یکساں طور پر منور ہوئے۔ اس بنا پر مذہبی احساسات کے معاملے میں بھی ان دونوں ممالک کے اندر کافی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایران کی زبان فارسی تو ایک مدت دراز تک پاک وہند کی سرکاری زبان رہی ہے اور اس کے نہایت گہرے اثرات ہماری زبان اور ادب پر آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جو ملک نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے ہمارے بالکل قریب ہو بلکہ تہذیبی، معاشرتی، مذہبی اور لسانی رشتوں کے لحاظ سے بھی ہمارے ساتھ وابستہ ہو اُس کی تاریخ سے ہم بے بہرہ رہیں۔ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی ستائش کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اُردو زبان میں نہایت جامع اور مستند تاریخ مرتب کرکے ہمیں اپنے دوست اور ہمسایہ ملک کے پس منظر

اور اتفاع کو سمجھنے میں مدد دی ہے۔ پروفیسر صاحب نے بڑی محنت اور دیدہ وری سے اس کتاب کی تدوین کی ہے اور مجلس ترقی ادب نے اسے نہایت اونچے طباعتی معیار کے ساتھ ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مفصل اشاریہ اور فہرست مآخذ بھی شامل کیے گئے ہیں

مقالاتِ یوم رضا | ترتیب و تقدیم: قاضی عبدالنبی کوکب صاحب حکیم محمد موسیٰ امرتسری۔ دائرۃ المصنفین (اندرون بھاٹی گیٹ) لاہور صفحات ۱۴۱ قیمت ڈھائی روپے۔ ملنے کا پتہ: شوکت برادرز۔ اردو بازار۔ لاہور

زیر تبصرہ کتاب اُن مقالات کا مجموعہ ہے جو مولانا احمد رضا خاں مرحوم و مغفور کی اٹھاونویں برسی کے موقع پر مولانا کی دینی خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے تحریر کیے گئے ہیں۔ کتاب کے دیباچہ میں اس کے فاضل مرتب نے جن احساسات کا اظہار کیا ہے وہ بڑے قابلِ قدر ہیں۔ انہوں نے فرمایا ہے: "یہ مختصر یادگار کتاب پیش کرنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ دیوبندی بریلوی اختلافات کی تلخیاں از سرِ نو تازہ کی جائیں۔ ہم ایک صاحبِ عقیدہ ملت ہیں اور ہماری تاریخ کے مختلف مراحل پر ہمارے متعدد مفکرین کے درمیان علمی اور فکری اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ بعد میں آنے والے لوگ اگر ان اختلافات کو غلط رنگ دے کر تفرق و تشتت کی خلیجیں وسیع کرنے لگیں تو اُسے یقیناً تخریبی اور منفی طرزِ عمل قرار دیا جائے گا"۔

اگر اس اصول کو سامنے رکھ کر ملتِ اسلامیہ کے سارے فرقے کام کریں تو آج وہ انتشار دُور ہو سکتا ہے جس کے بھیانک مناظر بسا اوقات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان بزرگوں کی دینی خدمات بھی نمایاں ہو کر سامنے آسکتی ہیں جو اکثر و بیشتر تعصبات اور عناد کی وجہ سے اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر سکیں۔ جو فرد یا ادارہ بھی خلوصِ نیت کے ساتھ مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان مناسبت کی راہ ہموار کرے وہ خالق و مخلوق دونوں سے ستائش کا مستحق ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس کے فاضل مرتب نے جس قابلِ قدر اصول کو سامنے رکھ کر اس کام کا آغاز فرمایا ہے وہ خود اس کی پوری طرح پابندی نہیں کر سکے۔ انہوں نے مولانا احمد رضا کے موقف کو تو نہایت مؤثر طریق سے بیان کیا ہے مگر دوسرے مسالک کے عقائد کے ساتھ انصاف

نہیں برتا۔ اُن کے مسلک کی غیر جانبدارانہ وضاحت تو الگ رہی انہوں نے جس انداز سے اُن کے اسمائے گرامی کا بھی ذکر کیا ہے وہ اُن جیسے وسیع النظر اور متوازن عالمِ دین کے مقام سے مطابقت نہیں رکھتا۔

کتاب کا معیارِ طباعت و کتابت عمدہ ہے اور اندازِ بیان سلجھا ہُوا ہے۔

مقامِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین | مرتب: جناب عاصم نعمانی صاحب۔ شائع کردہ: مکتبۂ آئین۔ ریلوے روڈ۔ لاہور۔ صفحات ۱۰۷۔ قیمت نیوز پرنٹ ۶۰ پیسے۔ سفید کاغذ: ۸۵ پیسے۔

زیرِ نظر کتابچہ مدیر ترجمان القرآن کی تحریروں سے اخذ کردہ اُن اقتباسات پر مشتمل ہے جن میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ غالبًا یہ انتخاب ان غلط فہمیوں کے ازالے کی نیت سے شائع کیا گیا ہے جو مختلف حلقوں کی جانب سے پھیلائی جاتی رہی ہیں۔

HOW TO SOLVE THE ECONOMIC PROBLEMS OF PAKISTAN

پاکستان کے معاشی مسائل کو کس طرح حل کیا جائے

تالیف: پروفیسر غلام اعظم صاحب قیم جماعت اسلامی مشرقی پاکستان۔ ملنے کا پتہ: دفتر جماعت اسلامی، محل پارا نیچ گاؤں، ڈھاکہ ۔۸۔ قیمت دس نئے پیسے۔

یہ کتابچہ فاضل مصنف کی زیرِ تصنیف کتاب "تحریک اسلامی کا رہنما" کا ایک باب ہے۔ اس میں پروفیسر صاحب نے پورے استدلال کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ پاکستان اس وقت جن معاشی الجھنوں سے دوچار ہے اس کا حل نہ تو سرمایہ دارانہ نظام میں مل سکتا ہے اور نہ اشتراکیت میں۔ بلکہ اس کے حل کی ایک ہی صورت ہے کہ اسلامی نظامِ حیات کو خلوص کے ساتھ اپنا لیا جائے۔ انہوں نے اسلامی اصولوں کے نفاذ کے لیے عملی تدابیر کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

علماء ربانی کون ہیں؟ | تالیف: مولانا محمد میاں نوشہروی۔ شائع کردہ: ادارۂ عروجِ اسلام، قلعہ گوجر سنگھ، لاہور۔ قیمت ۴ آنے۔

اس کتابچے میں علمائے حق کے اوصاف و اخلاق کو قرآن و سنت کی روشنی میں سلجھے ہوئے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

THE CRITERION
الفرقان

زیر ادارت: جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب۔ جناب کوکب صدیقی صاحب۔ جناب مصباح الاسلام فاروقی صاحب۔

مقامِ اشاعت: 113 P/2 PECHS کراچی نمبر ۲۹۔

سالانہ چندہ دس روپے۔ ایک مجلے کی قیمت ۲ روپے۔ صفحات ۸۰۔

اسلامک ریسرچ اکاڈمی، کراچی علمی محاذ پر احیائے دین کے لیے جو قابلِ قدر کوششیں کر رہی ہے اس میں اس دوماہی انگریزی پرچے کا اجرا ہر لحاظ سے قابلِ ستائش اضافہ ہے۔ ہمارے اس ملک میں فکری گمراہی کے جراثیم زیادہ تر انگریزی کے راستے سے آتے ہیں اور سب سے پہلے مغربی طرز پر تعلیم حاصل کرنے والے افراد ہی ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان حالات میں انگریزی زبان میں ایک اعلیٰ دینی پرچہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ جن اصحابِ علم کی ادارت میں یہ مجلہ شروع ہو رہا ہے اُن کی دینی بصیرت پوری طرح قابلِ اعتماد ہے۔ اسلام پسند حلقوں کو اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے تگ و دو کرنی چاہیے۔

مجلہ "خاتونِ پاکستان" کی خصوصی اشاعت
نزولِ قرآن نمبر

زیر ادارت: جناب شفیق بریلوی صاحب۔ مقامِ اشاعت: ۵۔ گارڈن، کراچی۔ ہدیہ دو روپے پچاس پیسے۔

قرآن مجید کی پہلی وحی حضور سرورِ کائنات کو ۲۷ رمضان ۱۳ قبل ہجرت، غارِ حرا میں ہوئی۔ اس پر چودہ صدیاں گزرنے کے بعد دنیا کے ہر خطے میں جہاں مسلمان آباد ہیں، وہاں نزولِ قرآن کی تقریبات منعقد کی گئیں۔ رسائل و جرائد نے خصوصی نمبر شائع کیے۔ معروف مجلہ خاتونِ پاکستان کا زیرِ تبصرہ نمبر بھی اسی سلسلہ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ فاضل مدیر نے بڑی محنت کے ساتھ مضامین اور نظموں کو جمع کر کے نہایت سلیقے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ حصۂ نثر اور حصۂ نظم دونوں جاندار ہیں۔ معیارِ طباعت و کتابت بھی عمدہ ہے

ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی قرآن نمبر	زیر نگرانی : جناب غلام قادر غبار ۔ سالانہ چندہ ۵ روپے ۔ اس خاص شمارے کی قیمت دو روپے پچاس پیسے ۔ مقام اجرا : انجمن فیض الاسلام،

اقبال روڈ ۔ راولپنڈی ۔

زیر تبصرہ شمارہ بھی نزولِ قرآن مجید کی تقریب منانے کے لیے شائع کیا گیا ہے ۔ اس نمبر میں بعض معروف مشہور اصحاب علم کی نگارشات شامل ہیں ۔ معیارِ طباعت و کتابت گوارا ہے ۔

علوم الحدیث | تالیف : ڈاکٹر صبحی صالح پروفیسر علوم اسلامیہ، آرٹس کالج، لبنان یونیورسٹی ۔ ترجمہ و تحشیہ : ۔ پروفیسر غلام احمد حریری صاحب صدر شعبہ : علوم اسلامیہ، مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی لائل پور ۔ شائع کردہ ملک برادرز پبلشرز کارخانہ بازار لائل پور ۔ صفحات ، ۵۱۷ ۔ قیمت ۱۵ روپے ۔

عرب مصنفین نے علم حدیث پر موجودہ دور میں جو چند مستند اور قابلِ اعتماد کتب تصنیف کی ہیں اُن میں یہ کتاب قابلِ قدر اضافہ ہے ۔ جناب پروفیسر غلام احمد حریری صاحب نے جو ملک کے نامور عالم دین ہیں اسے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے ۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے تاریخ تدوینِ حدیث، حجیتِ حدیث، حدیث کی قانونی اہمیت اور اصول حدیث پر بڑے مؤثر انداز میں بحث فرمائی ہے اور اُن سارے مغالطوں کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے جو جدید ذہن میں حدیث کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں ۔ آخر میں انہوں نے طبقات رواۃ پر بھی عمدہ معلومات فراہم کی ہیں اور معروف صحابہ، کبار تابعین تبع تابعین کا تعارف پیش کیا ہے ۔

اس کتاب میں جتنے موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان میں ہر ایک پر ہمارے اسلاف نے بڑا جاندار مواد فراہم کیا ہے لیکن کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس میں یہ سارے موضوعات یکجا موجود ہوں کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبا کے لیے یہ کتاب خاص طور پر مفید ہے ۔ عام قارئین بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں ۔ اس کے مطالعے سے وہ سارا عظیم الشان سامنے آجاتا ہے ۔ جو حضور سرور کائنات کی تعلیمات کو پوری صحت کے ساتھ محفوظ کرنے اور آگے پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے ۔

کتاب سفید کاغذ پر نہایت اچھے طباعتی معیار پر شائع ہوئی ہے۔

(بقیہ اشارات)

البتہ ہمیں پریشانی اُس وقت ہوتی جب خدانخواستہ ہم یہ دیکھتے کہ مفاد پرست اپنے مفادات کے پُشتارے اور انا پرست اپنی انانیت کے بوجھ لیے ہوئے جماعت کی طرف کھچنے لگتے۔ اس صورت میں بلاشبہ ہمیں اپنے حق پر ہونے میں شک لاحق ہو جاتا، اور ہمیں یقین ہے کہ اس صورت میں اس تحریک کو بھی سخت نقصان پہنچتا۔ مفادات کے بندے اور انا کے پرستار جتنے بڑے مقام اور مرتبے کے مالک ہوں اسی نسبت سے وہ دینی تحریک کے لیے مُضر ثابت ہوتے ہیں۔ اپنی شخصیت کی غیر معمولی اہمیت کا احساس، اپنی قابلیت کا غرور، اور معاشرے میں اپنے وسیع اثر و رسوخ کا گھمنڈ انہیں کبھی اس بات کی اجازت نہ دیتا کہ وہ جماعت کے غریب ساتھیوں کو، جو درحقیقت کسی تحریک کی جان ہوتے ہیں، درخورِ اعتنا سمجھیں۔ یہ صورتِ حال جب بھی پیش آتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جماعت کے نہایت مخلص مگر دنیاوی جاہ و جلال کے اعتبار سے کمزور ساتھی دل شکستہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، اور اُبھر کر وہ لوگ آتے ہیں جو مقصدِ حق کی بہ نسبت اپنے "آپ" کو عزیز تر رکھنے والے ہوتے ہیں۔

اسلام اینڈ ماڈرن ازم (انگلش)

از

مریم جمیلہ

دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن — قیمت -/۹ روپیہ

۲۶۸ صفحات۔ اعلیٰ طباعت۔ خوبصورت جلد۔

ملنے کا پتہ: (۱) محمد یوسف خاں سنت نگر، لاہور

(۲) مکتبہ یوسفیہ۔ اکرم مینشن نیلا گنبد، لاہور